راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا ۱۵واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

۲۰۱۳ء
جلد ۱۵ شمارہ ۷

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی
مدیر: حسن عباسی

متاعِ ضمیر

تبصرہ نگار: عامر بن علی

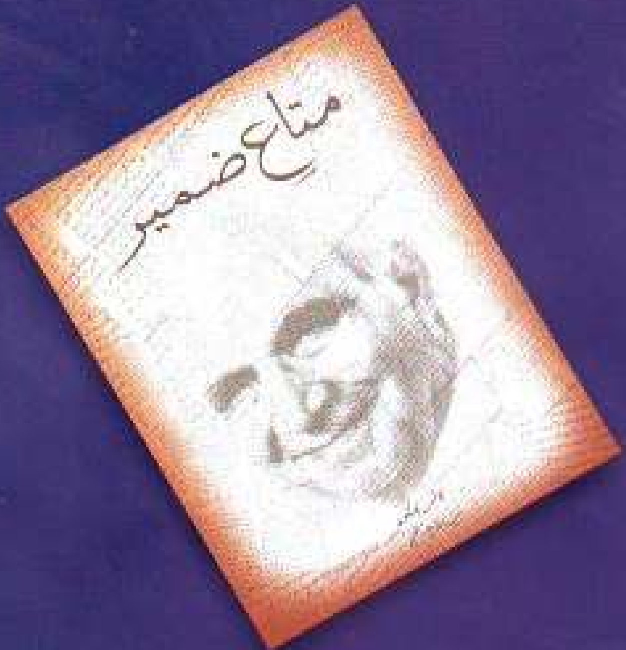

عصر حاضر کے اہم مسائل کا ہلکے پھلکے انداز میں تجزیہ اور ان پر تبصرہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ صحافت اور ادب میں ظرافت نگاری کو مشکل ترین صنف خیال کیا جاتا ہے۔ کالم نویسی کے فن میں جو شگفتگی اور برجستگی سید احتشام ضمیر کے ہاں پائی جاتی ہے وہ سخن وروں کی کہکشاں میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔ ان کے طنزیہ نشتر بھی شگفتگی میں بجھے ہوئے ہیں۔ نازک سے نازک بات ایسی سہولت اور شائستگی سے لکھ جاتے ہیں جسے کہتے ہوئے اچھے اچھے لکھاریوں کے قلم کی سانس پھول جاتی ہے۔ ان کی تحریروں میں بیک وقت شوخی بھی ہے اور سادگی و سلاست بھی۔ اخبار میں ان کا پہلا کالم پڑھتے ہی میرے ذہن میں تو یہ سوال اُبھرا تھا کہ ایسا باکمال لکھاری اب تک دریافت کیوں نہ ہوسکا؟ اور کیونکر قارئین کی نظروں سے اوجھل رہا؟ عین ممکن ہے ”متاعِ ضمیر“ پڑھ کر آپ کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آئے۔ خیر دیر آید، درست آید۔

سید احتشام ضمیر اور سید ضمیر جعفری کا تقابلی جائزہ تو کسی بھی اعتبار سے جائز نہیں ہوگا مگر مشتاق احمد یوسفی کا یہ کہنا کہ ”احتشام ضمیر کے قلم میں باپ والی کاٹ ہے“ اپنی جگہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف کیے بغیر بات مکمل نہیں ہوتی۔ ان کے موضوعات میں ایسا تنوع ہے جو ہم عصر اہلِ قلم میں کم کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ ایک خوبصورت پہلو تو ان کی تحریروں کا یہ بھی ہے کہ اپنی کہی ہوئی باتوں کو دہراتے نہیں ہیں۔ اسی لیے ہمیشہ ان کے کالم کا انتظار رہتا ہے۔ آج کل ہمارے ذرائع ابلاغ میں مایوسی کی بات کرنا فیشن ہے، ایسے ماحول میں اُمید اور روشن مستقبل کی بات کہنے کے لیے کافی حوصلہ درکار ہے۔ میرے نزدیک تو یہ عمل عین عبادت ہے۔ سید احتشام ضمیر کا امتیاز ہے کہ انہیں حقائق کا مکمل ادراک ہے۔ اس کے باوجود وہ پاکستانی قوم کے روشن مستقبل کے لیے پُراُمید ہیں۔ مقبولیت کی بجائے معقولیت ان کے نزدیک زیادہ اہم بات نظر آتی ہے۔ ان کے طنز و مزاح میں بھی دردمندی چھلکتی ہے۔ عمومی طور پر اساتذہ کرام کالم نویسی کو ادب کا حصہ نہیں مانتے مگر میری رائے میں ”متاعِ ضمیر“ ادبِ عالیہ میں داخل ہے۔ ادب کے قاری کی حیثیت سے میں ان کا ذاتی طور پر اس بات کے لیے شکرگزار ہوں کہ انہوں نے وطن عزیز کے سپاہی کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دینے کے بعد دفاعی تجزیہ کار بننے کی بجائے قلم کے ذریعے خدمت کو افضل سمجھا۔

اعلیٰ طباعت، معیاری امپورٹڈ کاغذ پر اس کتاب کو نستعلیق مطبوعات لاہور نے شائع کیا ہے۔ متاعِ ضمیر کا دیباچہ عطاء الحق قاسمی نے تحریر کیا ہے۔ ان کے علاوہ جمیل یوسف، انور نسیم، روبینہ تحسین بینا، سرفراز شاہد، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، جبار مرزا، الطاف حسین قریشی اور راقم الحروف کی آراء اس کتاب میں شامل ہیں۔

کتاب کا سرورق بڑا جاذبِ نظر ہے۔ کتاب میں رنگین تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ کالموں کے مجموعے کے لیے تصویروں کی شمولیت ایک نیا تجربہ ہے۔ مگر دیدہ زیب اور خوب لگ رہا ہے۔

تین سو صفحات پر مشتمل اس خوبصورت کتاب کی قیمت صرف 400 روپے ہے۔

Read Arxang Online
www.amirbinali.com
www.millat.com

"......اور مت پردہ پوشی کرو سچ کی جھوٹ سے نہ چھپاؤ سچائی کو جب تم جانتے ہو۔" (القرآن)

MONTHLY ARXANG LAHORE.

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 15 مہینہ جولائی 2013ء شمارہ نمبر 7

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی مدیر: حسن عباسی

مدیران اعزازی: ڈاکٹر صغرا صدف، ابرار ندیم،

نائب مدیر: زبیر بشیر معاون مدیر: علی رضا، کامران ندیم

قانونی مشیر: ناصر علی 0322-4702353

قیمت فی شمارہ 60 روپے زرِ سالانہ مع ڈاک خرچ 1000 روپے

پتا برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ

اُردو بازار، لاہور 0300-4489310

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ مع ڈاک خرچ (پاکستان) 1000 روپے

سالانہ ممبر شپ مع ڈاک خرچ (برائے بیرون ملک پاکستان) 5000 روپے

رابطہ 0331-4489310 0300-4489310

نعتیہ کلام: ارسلان ارسل ' ۲

مضامین:

- حسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے / ڈاکٹر صغرا صدف ' ۳
- گوہر ہوشیار پوری کا پیرایہ غزل / پروفیسر محمد مرغوب ' ۵

طنز و مزاح

- ٹھڈے اور ٹھوکے / عطاء الحق قاسمی ' ۶
- بونا نہیں بے وقوف / گل نوخیز اختر ' ۷

متفرق شاعری: ۹ تا ۱۱

افسانے:

- غم کا پچھلا پہر / عذرا اصغر ' ۱۲
- ایک ہی منزل / نازاوکا ڑوی ' ۱۵
- محبت رو رہی تھی / شہزاد ملک ' ۱۸

سفرنامہ:

- رُوسی عورت کے شب و روز / سلمیٰ اعوان ' ۲۰

شعری گوشے: روحی کنجاہی، امجد اسلام امجد، ظہور الاسلام جاوید، ناصر علی سید، مظفر حسن منصور، سعید آسی، شوکت علی ناز، عبد الرحمٰن انجم، زاہد عباس سید، امین اڈیرائی، اعظم توقیر، فرتاش سید، صوفیہ بیدار، تن دیپ تمنا، توقیر تقی، منیر انور، نوید ملک، فاطمہ احمد، لبنیٰ صفدر، مسرت یاسمین، ۲۳ تا ۳۲

تبصرۂ کتب ' ۳۳ تا ۳۵

ادبی خبریں / تقریبات ' ۳۶

پنجابی شاعری: ۳۹ تا ۵۰

پنجابی افسانہ: ہنیرے چوں اواز / ملک شاہسوار علی ناصر ' ۵۱

نامہ ہائے احباب ' ۵۲ تا ۵۳

Poetry Ayesha Zee Khan ' 56

Poetry Hassan Abbasi / Translation: Husnain Sehr ' 55

بیرون ملک ارژنگ دوست

- امریکہ، شکیل سروش
- بحرین، اقبال طارق
- دوحہ، قیصر مسعود
- سعودی عرب، اسلم گمان
- دبئی، سلمان جازب
- ابوظہبی، طارق بٹ
- کویت، صفدر علی صفدر
- یوکے، سعدیہ سیٹھی
- ناروے، ارشد شاہین
- شارجہ، نوید انور
- کینیڈا، شعیب صادق
- اسپین، نذیر اے قمر
- فرانس، اسد رضوی
- آسٹریلیا، ظفر اسلام
- سویڈن، عابدہ سیال
- ڈنمارک، صفدر علی آغا
- العین، سعید پسروری

Far East Marketing Co.
Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5,
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003, Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

عامر حسین پبلشرز نے زاہد بشیر پرنٹرز ریٹی گن روڈ سے چھپوا کر اردو بازار لاہور سے شائع کیا

ارسلان احمد ارسل/ لاہور

ہاتھ اُٹھتے ہی مرا ماحول روشن ہوگیا
ایسی پھیلی ہر طرف حرفِ دُعا کی روشنی

آج پھر شہر نبیؐ کی اتنی یاد آئی کہ بس
حاضری کے شوق نے لی ایسی انگڑائی کہ بس
جب بھی مشکل میں پکارا المدد یا مصطفیٰؐ
مجھ کو حاصل ہوگئی ایسی توانائی کہ بس
دشمنانِ دیں کے لشکر ہوگئے پل میں فرار
ذوالفقارِ حیدری اسطرح لہرائی کہ بس
لب کوئی کھولے نہ کھولے دل سے دے دے بس صدا
آپؐ کے دربار میں ہے ایسی شنوائی کہ بس
جب معافی مانگنے پہنچا تری سرکار میں
اپنے جرموں سے مجھے ایسی حیاء آئی کہ بس
دفعتاً پھر آنسوؤں کے ہوگئے چشمے رواں
خوف سے یہ روح میری ایسی تھرّائی کہ بس
روتے روتے جب میں اپنی جان سے جانے لگا
یک بہ یک پھر اُس طرف سے یہ صدا آئی کہ بس
مدحتِ احمد کہاں اور بے ہنر ارسل کہاں
نعت خود سرکار نے اس طرح لکھوائی کہ بس

ہم بناوٹ سے نہیں کہتے کہ ہم تیرے ہیں
ہم ترے در کی اٹھاتے ہیں قسم، تیرے ہیں
چوم کر جن کو ملے کیف و سرور و مستی
کیسے تاثیر رسا نقشِ قدم تیرے ہیں
غمِ دنیا تھا کبھی پہلے نہ اب ہوگا کبھی
شکرِ ایزد کہ میرے سینے میں غم تیرے ہیں
ہوں ابوبکر و عمر یا کہ ہوں عثمان و علی
سارے تابندہ یہ اصحابِ حشم تیرے ہیں
خوف کیا پیاس کی شدت کا بروزِ محشر
ہم کہ پروردہ و آسودۂ یم تیرے ہیں
تو گدایانِ محمدؐ کا گدا ہے ارسل
بس اسی واسطے دنیا میں بھرم تیرے ہیں

جب بڑھی فاران کی جانب حرا کی روشنی
سارے عالم میں ہوئی نورِ خدا کی روشنی
بت کدوں کے بجھ گئے خود ساختہ اندھے چراغ
دہر میں پھیلی جب ان کے نقشِ پا کی روشنی
ہاتھ اٹھتے ہی مرا ماحول روشن ہوگیا
ایسی پھیلی ہر طرف حرفِ دعا کی روشنی
آپؐ سے جس نے بھی مانگی روشنی کی اک کرن
ہوگئی اس کو بھی عطاء پھر انتہا کی روشنی
تختِ شاہی چھوڑ کر جو بن گیا ان کا گدا
دیکھنے والوں نے دیکھی اس گدا کی روشنی
میں غزل کو ترک کرکے لکھ رہا ہوں نعتِ پاک
دور تک پھیلے گی میری اس نوا کی روشنی
شکل اپنی دیکھ لے اک بار ارسل غور سے
تجھ نکمے کو ملی ان کی ولا کی روشنی

جب جان و دل سے آپؐ پہ قربان ہوگیا
پھر یہ ہوا کہ صاحبِ دیوان ہوگیا
عرفانِ حق اسی کو ہوا ہے جہان میں
جس کو مرے حضورؐ کا عرفان ہوگیا
صد شکر کہ خیال میں طیبہ پہنچ گیا
صد شکر کہ حضور کا مہمان ہوگیا
جب سے درودِ پاک مرا وردِ جاں ہوا
غم جیسے میری ذات سے انجان ہوگیا
آقا کے سامنے ابھی نظریں جھکائی تھیں
ارسل بہشت جائے گا اعلان ہوگیا

جب تلک آنکھ نم نہیں ہوتی
نعتِ حضرت رقم نہیں ہوتی
کچھ بھی لکھ لیجیے، ثناء کے بغیر
آبروئے قلم نہیں ہوتی
حسرتِ دیدِ نقشِ پائے رسولؐ
بڑھتی جاتی ہے کم نہیں ہوتی
ہجرِ طیبہ بھی ایک نعت ہے
حاضری ہی اہم نہیں ہوتی
میرے آقا بیان اب مجھ سے
داستانِ الم نہیں ہوتی
ہم غلاموں کی خستہ حالی پر
کیوں نگاہِ کرم نہیں ہوتی

حُسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے؟

ڈاکٹر صغریٰ صدف

ایک عظیم کائناتی حقیقت نہ جانے کس طرح نوجوان شاعر عامر بن علی کے تخیل میں پرواز کر کے ایک ایسے اعلیٰ شعر میں ڈھل گئی جو نہ صرف شعریت، ابلاغ اور خوبصورتی کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہے۔ بلکہ مقبولیت کے باعث ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ حسن اور حکومت دراصل دو طاقتوں کے نام ہیں۔ کائنات میں ہرسو ان دو طاقتوں کا راج نظر آتا ہے۔ جبکہ وحدت الوجودی فلسفی کہتے ہیں کہ دوئی نظر کا دھوکہ ہے اور یہ طاقتیں دو نہیں ایک سکے کی طرح ایک ہی حقیقت کے دو پہلوؤں کی مانند ہیں یعنی ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ناممکن ہے۔ اگر ہم حسن کو خیر، نور، فلاح، نیکی اور عشق کو عمل، جنون اور حکومت کے معنی ومفہوم میں سمجھنے کی کوشش کریں تو بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ سیاست کو بھی اسی حوالے سے پرکھا جا سکتا ہے کہ سیاست کی پرخطر راہ کا انتخاب کرنے والے دولت وثروت، دنیاوی جاہ وجلال اور تخت وتاج کے بجائے انسانیت کی خیر اور فلاح کے مقصد کے حصول کے لیے میدان عمل میں آتے ہیں اور حکومت کے ذریعے اپنے خوابوں کو حقیقت کا روپ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

حالیہ انتخابات کے نتیجے میں وجود میں آنے والی حکومت کے ابھی تک جو بیانات اور اقدامات سامنے آئے ہیں وہ ان کے نیک ارادوں اور طلب خیر کی خواہش پر مبنی ہیں۔ یہ محض اتفاقات نہیں پاکستان میں کچھ اچھا ہونے والا ہے۔ یہ مشیت ایزدی ہے کہ جب کسی قوم کے قسمت سنوارنا مقصود ہو تو ایسے سبب پیدا کر دیتے جاتے ہیں جن کے باعث منزل آسان ہو جاتی ہے۔ دراصل دنیا میں اتفاق نام کی کوئی چیز وجود میں نہیں رکھتی۔ جنہیں ہم حسین اتفاقات کا نام دیتے ہیں۔ سب قدرت کے پیدا کردہ وسیلے ہوتے ہیں جو فرد اور قوم کو مایوسی کے اندھیروں سے نکال کر غیر متوقع طور پر خوشحالی کی سڑک پر گامزن ہونے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ قدرت کی طرف سے راستے کی نشاندہی اور نقشے کی فراہمی کے بعد فرد اور قوم اپنے تدبر، عمل، فکر اور کاوش سے منزل تک پہنچتے ہیں۔ اختیار اور بے اختیاری، تقدیر اور تدبیر ملا جلا عمل ہے۔ بے یقینی اور خوف میں گھرا ہوا انسان آندھیوں کی زد میں رہتا ہے۔ جب قدم پوری قوت سے زمین کے ساتھ منسلک ہوں تو وجود اس طاقتور پیڑ کی شکل اختیار کر لیتا ہے جسے دیکھ کر طوفان بھی اپنا رخ تبدیل کر لیتے ہیں۔ دل میں پھوٹنے والی یقین، خیر اور خدمت خلق کی فصل کو پروان چڑھانے کے لیے پوری کائنات حرکت عمل میں آ جاتی ہے۔ دشواریاں آسانیوں میں تبدیل ہوتی جاتی ہیں اور رکاوٹیں رہبر کا روپ دھار لیتی ہیں۔

میرا ایمان ہے کہ پاکستانی قوم کی قسمت بدلنے والی ہے ورنہ اتنی بے یقینی کی فضا میں ایک سیاسی جماعت کا اکثریت حاصل کر کے مضبوط حکومت کی بنیاد رکھنا بلوچستان کے مسئلے اور حکومت سازی کے حوالے سے تاریخی فیصلے کر کے بلوچوں کے دل جیتنا اور انہیں پھر سے قومی دھارے میں شامل کرنا خیبر پختونخوا اور سندھ میں دیگر جماعتوں کے مینڈیٹ کو کھلے دل سے قبول کرنا حکومت اور اپوزیشن کا ملکی مفاد کے لیے سیاسی اختلافات نظر انداز کر کے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا ایک ڈکٹیٹر کے ہاتھوں زخم کھانے کے بعد تدبر اور فہم و فراست سے دوبارہ مسند اقتدار تک رسائی حاصل کرنا۔ عدلیہ، آرمی اور انتظامیہ میں باہمی ہم آہنگی پیدا ہونا دراصل حسن اور خیر کی وہ تجلیاں ہیں جو پاکستان کے جمہوری اور سیاسی سفر کے سنہرے دور کے آغاز کے طور پر تاریخ کے اوراق پر درج ہو رہی ہیں اور پاکستان کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر روشنی کا ہم سفر بنانے میں معاون ثابت ہو رہی ہیں۔ چیلنج اپنی جگہ مگر جب قوم یکجا ہو، ادارے مضبوط اور اپنی کارکردگی میں آزاد ہوں، نیت خیر ہو تو مسائل کے پہاڑ ریت کے ٹیلے بن جاتے ہیں اور جذبوں کی تیز ہوا انہیں باقی نہیں رہنے دیتی۔ میرے ملک میں اجتماعی سوچ حسن اور خیر میں ڈھلنے کا سفر شروع کر چکی ہے۔ اب عشق کو ان تجلیوں کی طاقت سے عمل کو یقینی بنانا ہے۔ حکومت

کو اپنی رٹ قائم کر کے دکھانا ہے۔ دگرگوں معاشی صورتحال کو بہتری کی طرف لانے کے ساتھ ساتھ قومی خودمختاری کے لیے ہر قسم کی غیر ملکی مداخلت کو روک کر ملک میں جاری وحشت اور دہشت کے کھیل کے سوداگروں سے سودے بازی یا کک مکا کر کے ڈنگ ٹپاؤ کی پالیسی ترک کرنا ہوگی اور ان کے سامنے جھکنے کے بجائے مفاہمت اور تدبیر سے راست قدم اُٹھانا ہوگا اور یہ سارے کام گوادر پورٹ کی طرح آخری دنوں میں نہیں بلکہ یہیں سے ہی شروعات ہونی چاہیے۔ جو کام کرنا ہے اس میں دیر نہیں اور جو نہیں کرنا اس کا متبادل تلاش کر کے شروع ہو جائیں ورنہ اس شعر کا دوسرا مصرعہ بہت ظالم ہے۔

حُسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

یہ حقیقت ہے کہ حسن اور طاقت انسان کی کمزوری ہے۔ حکومت بھی طاقت کی ایک شکل ہے۔ لوگ گھروں، خاندانوں، اداروں اور علاقوں میں کسی نہ کسی حوالے سے اپنی خوا اں کو حقیقت کا روپ دیتے رہتے ہیں۔ جبکہ دلوں کی بستی میں قیام کرنے والے مطیع ہونے میں سرشاری محسوس کرتے ہیں۔ کیوں کہ خود کو ہار کر جو بازی جیتی جاتی ہے اس کی مسرت کا نعم البدل کوئی نہیں۔ حُسن اور حکومت دونوں کی عمر بہت ہی کم ہوتی ہے۔ ظاہری حُسن ڈھل جاتا ہے اور حکومتوں کی میعاد بھی ختم ہو جاتی ہے۔ صرف ظاہر کے اسیر جدید مصنوعی طریقوں سے ظاہری حُسن کو کچھ دیر اور قائم رکھنے میں لگے رہتے ہیں۔ اسی طرح طاقت کے اسیر غیر جمہوری طریقوں سے حکومت پر قابض ہو جاتے ہیں۔ مگر حرفِ تحسین انہی کا مقدر بنتا ہے جو آنکھوں میں روشنی اور لبوں پر ہنسی کے دیے جلا کر دلوں کو جیتنے کا جتن کرتے ہیں یہی حُسن ہے۔ اعلیٰ تصورات کی پاسداری، زندگی گزارنے کا ڈھب، تعصب سے پاک نظریات اور مثبت فکر انسان کو ایسا حُسن عطا کرتی ہے جسے کبھی زوال نہیں۔ عمر اور زندگی کی بھی کوئی قید نہیں۔

سقراط آج بھی زندہ اور حسین ہے۔ خواہش اور دعا ہے کہ موجودہ تمام اسمبلیاں بھی اپنی طبعی عمر ضرور پوری کریں۔ مگر پانچ سال گزرتے دیر نہیں لگتی۔ اس لیے ہر لحہ تدبیر اور عمل کے ذریعے وطن کو حسین بنانے کا آغاز آج اور ابھی سے شروع ہو جانا چاہیے۔ حکومت کا مطلب اختیار اور عمل ہے۔ اسے کسی صورت بھی بے بس اور بے اختیار نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ اگر حکومت بے بس اور بے اختیار ہو جائے تو قوم کا مورال پست ہو جاتا ہے اور معاشرے کی تمام خوبصورتی تباہ ہو جاتی ہے اور بدصورت معاشروں کی قوموں کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ آیئے مل کر اپنے وطن کو حسین اور طاقتور بنائیں۔

2012ء کی بہترین شاعری کا انتخاب
ترتیب و انتخاب
محمد عاصم بٹ
تخلیقات، بیگم روڈ، مزنگ، لاہور

طنز و مزاح کے پچاس سال
عطاء الحق قاسمی
شاداب موسموں کی آواز
نستعلیق مطبوعات
فیروز سنز غزنی اسٹریٹ، اُردو بازار لاہور
042-37351963

معروف شاعر عامر سہیل کا
تازہ شعری مجموعہ
کچھ طائر پنکھ گراتے ہیں
شائع ہو گیا
انتساب: عطاء الحق قاسمی
دیباچہ: محمد اظہار الحق
ملنے کا پتہ
بک ہوم پبلشرز
بک اسٹریٹ صفانوالہ چوک، لاہور
042-37351963

چلتا رہنے دو میاں سلسلہ دلداری کا
عاشقی دین نہیں ہے کہ مکمل ہو جائے
(عباس تابش)

گوہر ہوشیار پوری کا پیرایۂ غزل

پروفیسر محمد مرغوب

اردو غزل اپنے ظہور سے لے کر آج کے دور تک انسانی احساسات، معاملات اور تجربات کی ترجمان رہی ہے۔ دوسری اصناف میں نئے دور کے تقاضوں اور ضرورتوں کے پیشِ نظر نئے تجربے، نئی ہیئتوں میں سامنے آتے ہیں۔ مگر غزل نے اپنی پہچان نہیں بدلی۔ اس نے اپنے کلاسیکل دور میں بڑے بڑے اساتذہ پیدا کیے جو اپنی ذات میں سند کا درجہ رکھتے ہیں اور جنہوں نے غزل کے رموز و علائم میں اپنی انفرادیت بھی قائم رکھی۔ بدلتے ادوار کی انفرادیت غالب، حالی، اکبر الہ آبادی اور اقبال کی غزل میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ ہر شاعر نے اپنے زمانے کے مفاہیم اپنی غزل میں بیان کیے۔ یہاں تک کہ فیض کی غزل اپنے دور کی نباض ہے۔ ہمارا موجودہ دور بھی کچھ وقفہ گزرنے کے بعد کلاسیکل بن جائے گا۔ شاعر کا اصل کام یہ ہے کہ وہ بقول گوہر ہوشیار پوری "طلسم کدہ حیرت میں ڈوب کر اصلیت کا سراغ لگانے اور ایک سائنسدان کی طرح رموز کائنات کی پیچیدگیوں کے بارے میں مسلسل غور و فکر کرے۔" بقول احمد ندیم قاسمی "میر و غالب کے بعد غزل کے لہجے میں اس کے مفاہیم میں، اس کے رموز و علائم میں تبدیلیاں آئیں لیکن یہ عجیب صنف ہے کہ یہ وقت کا ساتھ بھی دیتی ہے اور غزل بھی رہتی ہے۔"

جناب گوہر ہوشیار پوری کی غزل ہمارے زمانے کی مثالی غزل ہے۔ ان کی نمایاں خوبی ان کے اسلوب بیان کی سادگی ہے۔ یہ سادگی ریاضت کے بغیر ممکن نہیں اور بات کو مشکل بنانے کے لیے ریاضت کی ضرورت نہیں۔ گزشتہ صدی کے معروف عالمی فلاسفر برٹرینڈ رسل کا کہنا ہے کہ مجھے سادہ اسلوب کے لیے مشقت کرنا پڑی۔ جناب گوہر ہوشیاری کی یہ خصوصیت کہ وہ کسی پیچیدہ بات کو نہایت سہولت سے سمجھا سکتے ہیں۔ ان کے عظیم شاعر ہونے کی قوی دلیل ہے۔ ان کے ہر سفر میں سمندر کوزے میں بند ہے۔ ایجاز اور ایمائیت ان کی سوچ کا امتیاز ہے۔ وہ کڑ کتے ہوئے الفاظ کی بجائے نتیجہ خیز مفہوم کو مقدم رکھتے ہیں۔ وہ زندگی اور کائنات کے مسائل کو نہایت باریک بینی سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے زمانے کے کرب اور مصائب کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ وہ ان مسائل کو سلجھانے اور سمجھانے کی جرأت رندانہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے کلاسیکی غزل کی بلندیٔ فکر سے کماحقہٗ استفادہ کیا ہے۔

ان کی ایک اور خوبی جس کے بغیر ان کے استدانہ کمال کا اعتراف نہیں ہو سکتا وہ ان کا چھوٹی بحروں کا استعمال ہے۔ سچ پوچھیے تو ان کی یہ بحریں شارٹ ویو (Short Wave) کی طرح ہیں۔ وہ ان کی شاعری کی نشرگاہ سے نکلتے ہی خلائے بسیط میں Ionoshere سے ٹکرا کر چار دانگ عالم میں پھیل جاتی ہیں۔ انہوں نے ایجاز و ایمائیت کو درجہ کمال تک پہنچایا ہے۔ ان کی غزل میں کھل کھیلنے کا رجحان نہیں پایا جاتا۔ معاملات حسن و عشق ان کے یہاں گہری معنویت میں وارد ہوتے ہیں۔ وہ بلندیٔ فکر میں غالب کے پیروکار ہیں لیکن اسلوب میں وہ اپنی انفرادیت پر قائم ہیں۔ ہر اچھے غزل گو کی طرح وہ اپنے عصری تقاضوں کو سمجھتے بھی ہیں اور اس کا برملا اظہار بھی کر سکتے ہیں۔ ان کی آفاقی سوچ اقبال کا فیضان ہے۔

بحیثیت انسان جناب گوہر ہوشیار پوری سادہ مزاج اور درویش صفت تھے۔ وہ مردم آزادی اور مردم بیزاری سے قطعی طور پر مبرا تھے۔ انہوں نے انسان دوستی کی زندگی گزاری۔ پاکستان سے نکلنے والے اہم ادبی رسائل و جرائد میں ان کا کلام شائع ہوا۔ ساہیوال اور لاہور میں مقیم نامور ادبی شخصیات سے انہوں نے کسب فیض کیا۔ اپنے ہم عصر شعرائے کرام کا حق رفاقت ادا کیا۔ نوجوان شاعروں کو اپنے سایۂ شفقت سے نوازا۔ ادبی مجالس کو رونق بخشی۔ یہ چند سطور تحریر کرتے وقت میرے پیش نظر ان کا اولین مجموعہ کلام "پیرایہ" رہا۔ بخوف طوالت میں اس شجر سایہ دار کے صرف دو پتے یعنی دو غزلیں آپ کے سامنے رکھوں گا جس سے آپ کو اس شجر کی تمام خصوصیات کا اندازہ ہو جائے گا۔

یہ جھونکے پروائی کے
آئے دن رُسوائی کے
نکلی آب محبت کی
کچے رنگ جدائی کے
لے موسم تبدیل ہوا
اے موسم تنہائی کے
پہرے رہ نوردوں پہ
دعوے راہ نمائی کے
انسانوں نے سیکھ لیے
سارے کھیل خدائی کے
بس اک شوق حقیقت کا
سو امکان رہائی کے
تو ہر بات میں باک نہیں
کیا آداب دہائی کے

....

طبع جنوں سرشت ہی کچھ حیلہ جو نہ تھی
توفیق ضبط تھی کہ مجال رفو نہ تھی
آخر کبھی تو جرعۂ صہبائے لطف بھی
مے سے مری مراد مئے آرزو نہ تھی
اتنا بھی سخت قحط مروت کبھی نہ تھا
ناموس درد اتنی بھی بے آبرو نہ تھی
تو وضع خامشی کا زباں آشنا نہ تھا
اظہار اپنے نطق تمنا کی خو نہ تھی
اور کچھ زخم خوردہ سیلِ صرصر سے تھی بہار
کچھ زمین شور میں تاب نمو نہ تھی
گوہر غزل کہی پئے تقریبِ عرضِ غم
اس کم سخن سے اور رو گفتگو نہ تھی

ٹنڈ اور ٹھونگے

عطاء الحق قاسمی

ہم نے بزعم خود گرمیوں کو رخصت کر دیا تھا مگر گزشتہ چند دنوں میں موسم نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ گرم ہواؤں کی جگہ خوشگوار ہواؤں نے لے لی ہے اور جنہوں نے چارپائیاں کمروں سے نکال کر صحن میں ڈال دی تھیں انہوں نے دوبارہ صحن سے کمروں کا رخ کیا ہے لیکن یہ بہت بے اعتبار موسم ہے، چنانچہ اس امر کا شدید امکان موجود ہے کہ جب یہ سطور شائع ہوں اس وقت لو چل رہی ہو اور چارپائیاں کمروں سے نکل کر صحن میں اور پر صحن سے مکان کی چھتوں پر پہنچ چکی ہوں۔

مگر کچھ لوگ دور اندیش بھی ہوتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ گرمیوں نے بہرحال سٹارٹ لے لیا ہے۔ آج نہیں تو کل یہ اپنا اصل روپ دکھائیں گی اور خلق خدا "ہاں ہاں" کرتی نظر آئے گی۔ چنانچہ ان لوگوں نے گرمی کی پوری شدت کا انتظار کئے بغیر ابھی سے حفظ ماتقدم کے طور پر ٹنڈیں کرانا شروع کر دی ہیں۔ سو ان دنوں میں ہم نے ایک نہیں ا س تین ٹنڈیں دیکھی ہیں۔ ان سر منڈانے والوں میں سے ایک نے تو اپنی ٹنڈ کے سلسلے میں تمام روایتی لوازمات پورے کئے تھے، یعنی پہلے سیدھے استرے سے سر منڈایا تھا، پھر الٹے استرے سے "فنشنگ" کرائی تھی۔ اس کے بعد آم کی گٹھلی سے اس چمکتی دمکتی شفاف ٹنڈ پر رگڑائی کرائی گئی تھی اور آخر میں مزید چمک کیلئے سرسوں کا تیل لگایا گیا تھا۔ سو یہ نوجوان جب اپنی چندیا کے ساتھ سامنے آیا تو "لشکارا جاوے گلی گلی" کا منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا ہم نے اس نوجوان سے پوچھا "تم نے ٹنڈ کیوں کرائی ہے" "نوجوان ستم ظریف تھا" بولا "آگے گرمیاں آ رہی ہیں سورج کی تیز کرنیں اس ڈھلان پر پڑیں گی تو خود بخود پھسلتی چلی جائیں گی"

نوجوان کی اس بات سے ہم نے جانا کہ گو یہ خاصا ستم ظریف ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بھولا بھی ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ بالفرض محال اگر سورج کی تیز کرنوں سے بچے گا تو یار لوگوں کے ٹھونگوں کی زد میں آ جائے گا۔ چمکتی دمکتی ٹنڈ اپنے سامنے پا کر ہم نے کئی شرفا کے ہاتھ میں کھجلی ہوتے دیکھی ہے اور پھر لڑائی ہوتے دیکھی ہے۔ ایک سینما میں ایک چندیا اپنے سامنے پا کر ایک "شریف" آدمی کے ہاتھوں میں کھجلی ہوئی اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ شرط باندھ کر اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور "اوئے اشرف تم یہاں بیٹھے ہو" کہہ کر ٹھاپ لگا دی "صاحب ٹنڈ" نے مڑ کر دیکھا تو انہوں نے معذرت کی انہوں نے یہ بے تکلفانہ حرکت انہیں اشرف سمجھ کر کی تھی۔ اس وضاحت پر یہ صاحب اپنی چندیا سہلاتے ہوئے چند قطاریں چھوڑ کر آگے ایک نشست پر بیٹھ گئے۔ ٹھاپ مارنے والے کے ہاتھوں میں کھجلی ابھی تک ہو رہی تھی۔ سو اس نے ایک بار پھر اپنے دوستوں کے ساتھ شرط باندھی اور اپنی سیٹ سے اٹھ کر ان صاحب کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا دو منٹ سانس لینے کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور "اوئے اشرف! تم یہاں بیٹھے ہوئے ہو، میں تمہارے دھوکے میں ایک شریف آدمی کو پیچھے چپت لگا آیا ہوں" کہہ کر ایک ٹھاپ اور لگا دی۔ اس شریف آدمی نے تلملا کر پیچھے دیکھا اور صرف جھنجھلا کر رہ گیا کیونکہ ٹھاپیں اسے نہیں "اشرف" کو پڑ رہی تھیں۔

ہمیں خدشہ یہ ہے کہ آنے والے موسم گرما میں بھی یہی کچھ ہونا ہے۔ یعنی ٹھاپیں مارنے والوں نے اشرف کا نام لے کر سب کو ٹھاپیں مارنی ہیں۔ سو ہمیں ذاتی طور پر ٹنڈ کرانا ایک خسارے کا سودا لگتا ہے، اس فعل کا مطلب یہ ہے کہ سورج کی کرنوں کو براہ راست "طبع آزمائی" کا موقع دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ٹھاپیں مارنے والے "یاران نکتہ داں" کے لئے بھی "صلائے عام" ہو ظاہر ہے یہ کوئی دانش مندی نہیں ہے۔ سو جس نے ٹنڈ کرانی ہے وہ اپنے رسک پر کرائے۔ ٹھونگوں کے ذمہ دار ہم نہ ہوں گے۔

❀❀❀

بونا نہیں بیوقوف

گل نوخیز اختر

کالا رنگ، پتلا جسم، لمبے دانت اور ملنگوں والا حلیہ...... جی ہاں! اس حلیے کا شخص جہاں بھی آپ کو نظر آئے سمجھ جائیں کہ وہ حافظ مظفر محسن بالکل نہیں۔ کیونکہ صاحب سراپا چمکدار ہیں۔ موصوف وہ دلچسپ شخصیت ہیں جن کی شخصیت میں چار پانچ ذاتیں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ لکھتے ہوئے شیخ ہو جاتے ہیں کہ کوئی فالتو لفظ نہیں لکھتے۔ ذاتی ملاقات میں بٹ بن جاتے ہیں یعنی مائنڈ کرنے والی باتوں پر بھی قہقہے لگاتے ہیں۔ ادبی محفل میں ارائیں بن جاتے ہیں یعنی کچھ نہیں کرتے اور اپنے چاہنے والوں سے مل رہے ہوں تو جھک جاتے ہیں۔ گویا حافظ مظفر محسن بن جاتے ہیں۔ حافظ صاحب کی شگفتہ مزاجی کی وجہ ان کی ''رضائی مجموعہ'' گفتگو بتائی جاتی ہیں جو نصف عشرہ پہلے بے وفائی اور عقلمندی کا ارتکاب کرتے ہوئے کسی غیر حافظ کی منکوحہ بن جاتی ہے۔ تاہم حافظ صاحب اس کی اس حرکت کو گناہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ چھ کتابوں کے مصنف حافظ مظفر محسن کو اگر مزاح کا ایک معتبر نام قرار دوں تو بے جا نہ ہوگا۔ خدا نے قلم میں ایسی طاقت دی ہے کہ سوئی چبھوئیں تو دراتی کا سواد آتا ہے۔ چونکہ شاعر بھی ہیں اس لیے مزاح لکھنے کو ترجیح دی۔ ان کی نئی کتاب بونا نہیں بیوقوف کا انتساب بڑا انوکھا ہے۔ اس میں حافظ صاحب نے لگ بھگ ڈیڑھ سو دوستوں کے نام لکھے ہیں لیکن ڈیزائننگ کچھ اس طرح کی ہے کہ دور سے یہ انتساب ایسا تعویذ نظر آتا ہے جسے دکان میں لٹکایا جائے اور روز ایک نظر دیکھا جائے تو روزی میں بڑی برکت ہو سکتی ہے۔ میں جب بھی حافظ صاحب سے ملتا ہوں مجھے اپنا رنگ مزید کالا لگنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے قدرت نے حافظ صاحب کا چہرہ تخلیق کرتے وقت اجزائے ترکیبی میں گولڈن سیب، دودھ بالائی، شہد اور سیف دوا خانے کی جملہ ادویات کا وافر استعمال کیا ہے۔ ایسے خوبصورت بندے کو غیر معتدل مزاج قسم کے حافظ کی دستبرد سے محفوظ رہنے کے لیے یقیناً خود بھی حافظ بن جانا چاہیے۔ میں نے حافظ صاحب کی کتاب دو دفعہ پڑھی ہے اور مجھے یہ کہنے کا حق ہے کہ حافظ صاحب کی اس کتاب پر ''ستارۂ جرات'' ملنا چاہیے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ آج کل سب کو گالیاں انفرادی طور پر نہیں اجتماعی طور پر دی جا رہی ہیں۔ یقین نہ آئے تو جب ساڑھے آٹھ بجے لوڈ شیڈنگ ہو تو اپنے کانوں سے سن لیں جو کچھ لوگ بے چاری واپڈا کی شان میں کہتے ہیں۔ جب بیچ دوپہر ٹرین کا انجن فیل ہو جائے تو ریلوے والے بھی بہت گالیاں سمیٹتے ہیں اور پولیس توبہ توبہ...... بہتر ہے کہ آپ مجھ سے اس وقت زیادہ فری نہ ہوں۔ پولیس جانے یا عوام۔ ابھی تو ہم پاکستان کی پارلیمانی تاریخ کی جانب نہیں جا رہے۔ وہاں تو کئی بار محض گالی کی وجہ سے کارروائیاں حذف کرنا پڑیں۔ پتہ چلتا ہے کہ عورت مرد اکثریت پارلیمنٹ میں من مرضی کی گالی بول سکتے ہیں۔ بیان کر کے داد سمیٹ سکتے ہیں۔ بس مشکل یہ ہے کہ اس فری سٹائل کی گفتگو کی ریکارڈنگ عوام کو سنائی نہیں جا سکتی۔ حافظ مظفر محسن ایک کھلکھلاتی، مسکراتی اور شرارتی شخصیت کا نام ہے۔ وہ مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر، کالم نویس اور کہانی کار بھی ہیں۔ دوستوں کے دشمن اور دشمنوں کے دوست ہیں۔ کچھ دن پہلے مجھ پر انکشاف ہوا ہے کہ حافظ صاحب اپنی جیب میں بھرا ہوا ریوالور بھی رکھتے ہیں۔ انہوں نے پہلے ریوالور پر میرا ہاتھ لگوایا پھر فرمائش کی کہ میری کتاب پر ایک مضمون تو لکھ دیں۔ سو میں دل کی گہرائیوں سے اعتراف کرتا ہوں کہ حافظ مظفر محسن ایک اعلیٰ درجے کے مزاح نگار ہیں۔ مزاح نگار کی ایک پہچان یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ شاعروں ادیبوں کی نسبت زیادہ خوش حال ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی حافظ صاحب مزاح نگاروں کی صف میں کھڑے ہونے کے پوری طرح اہل ہیں۔ منیر نیازی سے ایک دفعہ کسی سٹوڈنٹ نے مشاعرے میں پوچھ لیا کہ ''سر! آپ بھی شاعر ہیں؟'' دانت پیس کر بولے ''نہیں امجد اسلام امجد ہوں۔'' حافظ مظفر محسن کے بارے میں بھی مشہور

ہے کہ کوئی ان سے پوچھ لے کہ آپ مزاح نگار ہیں۔ تو اطمینان سے کہہ دیتے ہیں نہیں شاکر شجاع آبادی ہوں۔ میں اور حافظ مظفر محسن ایک ہی سلسلے کے مرید ہیں۔ ہم دونوں مزاح کے ''سلسلہ قاسمیہ'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے استاد محترم عطاء الحق قاسمی ہیں جنہوں نے اس وقت ہمیں اپنی شاگردی میں قبول کیا جب کوئی ہمیں اپنی فرزندگی میں لینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ حافظ صاحب محبتوں کے امین ہیں۔ فی زمانہ خود پر ہنسنا کوئی بہادری نہیں۔ اصل بہادری تو یہ ہے کہ دوسرے آپ پر ہنسیں اور آپ برداشت کریں۔ اس لحاظ سے حافظ صاحب کی قوت برداشت کی داد دینا پڑتی ہے۔ اپنے اوپر لگائے گئے جملوں کو بھی دانت پیس کر خوب انجوائے کرتے ہیں۔ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے ریڈیو پاکستان لاہور کے ایک پروگرام کی ریکارڈنگ کے بعد میں چائے پینے کے لیے ریڈیو کی کینٹین میں گیا۔ چائے سامنے آئی تو میں نے غور سے چائے کی طرف دیکھا۔ ایک گھونٹ بھرا اور چائے والے سے کہا ''عالی جاہ! نہ اس میں چینی ہے نہ پتی نہ دودھ...... لیکن آپ پندرہ روپے کا کپ دیتے ہیں۔ آپ کو کچھ بچتا بھی ہے یا نہیں؟ حافظ صاحب بھی محبتیں اور قہقہے بانٹتے پھرتے ہیں۔ اللہ جانے انہیں بھی کچھ بچتا ہے یا نہیں۔ استاد محترم عطاء الحق قاسمی صاحب نے حافظ مظفر محسن کو ایک جینوئن اور شگفتہ مزاح نگار قرار دیا۔ بالکل ٹھیک کہا۔ حافظ صاحب چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑا بڑا Laughter لینے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں لیکن اپنی تحریر کو محض مزاح تک محدود نہیں رکھتے۔ بلکہ بعض اوقات ایسی گہری بات کہہ جاتے ہیں کہ پڑھنے والا کچھ دیر کے لیے وہیں ساقط ہو جاتا ہے...... ایک جگہ لکھتے ہیں ''صنوبر خان نے اپنی واسکٹ کی جیب سے دس چلغوزے نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیے اور کہا لو مظفر صاحب موج کریں۔ میں نے چلغوزے کھانے شروع کر دیے۔ ایک دم خیال آیا کہ یار مظفر تو کتنا فضول خرچ ہو گیا ہے۔ ایک منٹ میں پچاس روپے کے چلغوزے کھا جاتا ہے۔ پھر یک دم خیال آیا کہ وہ بھی تو ہیں جو ایک منٹ میں کروڑوں کھا جاتے ہیں اور ڈکار بھی نہیں مارتے۔''

وطن عزیز میں بجلی، پانی، سی این جی اور مزاح نگاروں کی کمی شدت سے محسوس ہونا شروع ہو گئی ہے۔ ایسے میں حافظ مظفر محسن کی نئی کتاب نے پھر سے حوصلہ پیدا کر دیا ہے کہ ابھی ہنسنے ہنسانے والے جاگ رہے ہیں۔ یہ کتاب بالکل ویسی ہی ہے جیسے حافظ صاحب خود ہیں ہنستے مسکراتے، کھلکھلاتے اور خوبصورتی سے لبریز۔ میرے اپنے اس مزاح نگار دوست کو ایک اور اچھی کتاب کی اشاعت پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ کتاب کا نام ایک بار پھر نوٹ کر لیجیے۔ ''بونا نہیں بیوقوف...... حافظ مظفر محسن''

(الحمراء میں منعقدہ کتاب کی تقریب رونمائی میں پڑھا گیا)

❁❁❁

لگتا ہے تیری آنکھ ہے میرے وجود میں
رکھتی ہے جو خبر مری ایک ایک بات کی

ڈاکٹر صغریٰ صدف

القمر انٹر پرائزرز کی نئی مطبوعات

تنقیدات تحسین فراقی مرتبہ: اشتیاق احمد
جناب تحسین فراقی کے بلند پایہ مضامین کا عمدہ انتخاب۔ قیمت 700 روپے

رقعات مشفق خواجہ بنام ڈاکٹر سلیم اختر
ڈاکٹر طاہر تونسوی
جناب تحسین فراقی کے بلند پایہ مضامین کا عمدہ انتخاب۔ قیمت 700 روپے

تنقید کے مباحث مرتبہ: اشتیاق احمد
تنقید کے موضوع پر ایک جامع انتخاب، نادر و نایاب مضامین جو طلبہ کی ضرورت کو کما حقہ پورا کرتے ہیں۔
بڑا سائز قیمت 1500 روپے

محسن ملت چوہدری محمد علی
قیوم نظر چوہدری
تحریک پاکستان کے رہنما، سابق وزیر اعظم چوہدری محمد علی کی سوانح اور جدوجہد پر ایک خوبصورت کتاب۔
انتخاب۔ قیمت 250 روپے

داستانِ اقبال
آمنہ صدیقہ
جناب تحسین فراقی کے بلند پایہ مضامین کا عمدہ انتخاب۔ قیمت 700 روپے

مزاح راہ
علی رضا احمد
''دبئی آں'' اور ''ایرے غیرے'' کے بعد نیا مزاحیہ مجموعہ
قیمت 300 روپے

متفرق شاعری

بیادِ شہزاد احمد شہزاد

جاتے ہوئے بھی ہاتھ ملا کر نہیں گیا
کب آئے گا کسی کو بتا کر نہیں گیا
ہم انتظار میں رہے تازہ کلام کے
وہ آخری غزل بھی سنا کر نہیں گیا
جو بھی تھے اس کے دکھ وہ انہیں ساتھ لے گیا
زخم وفا کسی کو دکھا کر نہیں گیا
لگتا ہے جیسے وہ یہیں موجود ہے کہیں
لگتا ہے جیسے ساتھ چھڑا کر نہیں گیا
روئے ہیں دھاڑیں مار کر احباب موت پر
کیسے کہیں ہمیں وہ رُلا کر نہیں گیا
مہر و وفا کے، حسن عقیدت کے، پیار کے
کتنے حساب تھے جو چکا کر نہیں گیا
نصرت مرا خیال ہے وہ آئے گا ضرور
کہتے ہیں وہ چراغ بجھا کر نہیں گیا

نصرت صدیقی/فیصل آباد

نقش قدم اُٹھا کے تری رہگزار سے
دل میں بچا کے رکھ لیے گرد و غبار سے
تم خود ہی چل کے آ گئے ہوتے مرے قریب
میں مانگتا پھرا تمہیں پروردگار سے
بام فلک پہ کتنے ستارے ہیں ضوفشاں
اے محو خواب! پوچھ بھی اختر شمار سے
یہ آرزو ہے ٹوٹ کے یوں مل کسی طرح
اک اشکبار جیسے کسی اشکبار سے

ڈرتا ہوں یہ نہ ہو کہیں آنا ہی چھوڑ دے
ورنہ گلے تو ہیں مجھے فصل بہار سے
یہ متقی ہیں اور نہ پرہیز گار ہیں
یہ متقی سے اور یہ پرہیزگار سے
نصرت میں اپنے آپ کو اچھا بہت لگا
دیکھا ذرا جو خود کو کبھی چشم یار سے

نصرت صدیقی/فیصل آباد

مجھے تو خاک سے مولا اُٹھا لے
شہید صبر کا لاشہ اُٹھا لے
جسے حاجت ہو وہ پلکوں سے میری
کوئی موتی کوئی تارا اُٹھا لے
اُسے جانا ہی ہوگا سوئے مکتب
کہو بچے سے تو بستہ اُٹھا لے
نہ آئے فاختہ یوں ہاتھ خالی
وہ اپنی چونچ میں پتا اُٹھا لے
کہو پھولوں میں ڈوبے دیدہ ور سے
رُخِ پرنور سے سہرا اُٹھا لے
مجھے مرنا نہیں شعلوں میں ثاقب
مرا مالک مجھے زندہ اُٹھا لے

آصف ثاقب/ایبٹ آباد

عجب در پر سوالی تھا، میں اُس کو پھول کیا دیتی
وہ خود گلشن کا مالی تھا، میں اُس کو پھول کیا دیتی
خزاں کے آخری دن تھے، وہ خوشبو مانگنے آیا
میرا دامن ہی خالی تھا، میں اُس کو پھول کیا دیتی
کتاب زندگی میں، حرف اوّل بن کے جو چمکا
وہ اِک نقش خیالی تھا، میں اُس کو پھول کیا دیتی
قدم تھے آسمانوں پر، زمیں پر اُس کا سایہ تھا
غضب کا لا اُبالی تھا، میں اُس کو پھول کیا دیتی
مجھے تو عام سے لہجے میں اُس سے بات کرنا تھی
مگر وہ نسب عالی تھا، میں اُس کو پھول کیا دیتی

فرحت زاہد/لاہور

قریب آشیاں میں رہ رہا ہوں
کرائے کے مکاں میں رہ رہا ہوں
حصار دوستاں میں رہ رہا ہوں
مسلسل امتحان میں رہ رہا ہوں
وہ جب چاہے گا مجھ کو چھوڑ دے گا
میں دشمن کی کماں میں رہ رہا ہوں
گروں گا بھی تو میں اپنے ہی اُوپر
میں اپنی ہی اماں میں رہ رہا ہوں
جہاں ہر شخص کو اپنی پڑی ہے
میں اک ایسے جہاں میں رہ رہا ہوں
مہک اُٹھی جبیں سجدے سے میری
وفا کے گلستاں میں رہ رہا ہوں
میں تجھ کو یاد رکھوں یا بھلا دوں
عجب وہم و گماں میں رہ رہا ہوں
تعجب ہو رہا ہے سن کے زاہد
میں اُن کے ہر بیاں میں رہ رہا ہوں

زاہد سعید زاہد/لاہور

متفرق شاعری

کربلائیں ہی کربلائیں ہیں

ہے لہو رنگ سرزمینِ وطن
غم میں ڈوبی ہوئی فضائیں ہیں
کتنی مسموم اب ہوائیں ہیں
سہمی سہمی سی فاختائیں ہیں
آگ اور خوں کا کھیل جاری ہے
زندہ جسموں پہ چاند ماری ہے
روز ہی بم دھماکے ہوتے ہیں
مرنے والوں پہ روز روتے ہیں
روز ہی اب ڈرون آتے ہیں
پرخچے زیست کے اُڑاتے ہیں
بٹ کے ٹکڑوں میں دور دور تلک
جسموں کے چیتھڑے بکھرتے ہیں
خاک اور خون میں لتھڑے ہیں
کتنے سہمے ہوئے پرندے ہیں
دندناتے' یہاں درندے ہیں
ٹوٹتی ہیں قیامتیں ہر روز
ہر طرف مقتلوں کے منظر ہیں
اب مرے دیس میں جدھر دیکھو
کربلائیں ہی کربلائیں ہیں......!

احمد جلیل/اوکاڑا

کہاں کھو گئے ہو؟

مری راکھ ہوتی ہوئی زندگانی کے
شاداب لمحے!
کہاں کھو گئے ہو؟
کہ میں ایک بے سمت، بے کار
سی جستجو میں گھرا ہوں
مسلسل سفر ہے مگر اس سفر میں
نہ کوئی ستارہ مرا ہم سفر ہے
نہ اُمید کا کوئی موہوم لمحہ
مرے خوابِ جاں کو صدا دے رہا ہے
نہ کوئی نشانی کسی ہجر کی
میری زنبیل میں ہے
نہ کوئی تمنا مرے خاکداں کے
بکھرتے مناظر کی تحویل میں ہے
عجب بے کلی ہے
بہت خالی خالی سی یہ زندگی ہے
مری خاک ہوتی ہوئی
زندگانی کے شاداب لمحے!
کہاں کھو گئے ہو؟

ارشد نعیم/شیخوپورہ

لڑنا نہیں تو ہاتھ سے تلوار پھینک دے
لیکن یہ خوف برسرِ پیکار پھینک دے
واپس اسیر ہوتا ہوں دشمن کے میں مگر
اپنی شکست مان کے ہتھیار پھینک دے
تاریخ کا وجود بھی لرزاں ہے ضبط سے
حاکم کا حکم برسرِ دربار پھینک دے
کوئی نہ آ کے بیٹھے گا سائے میں اس کے بعد
اپنی اُنا کے سائے پہ دیوار پھینک دے
زہرہ جمال چشم فروز کے روبرو
اپنی ضرورتوں پہ نہ کردار پھینک دے
نکلے کوئی نہ تیری محبت کے شہر سے
ایسا حصار کھینچ کے پرکار پھینک دے
لڑ جا انانیت کے قبیلے سے اب اسدؔ
ایسے نہ اس کے پاؤں پہ دستار پھینک دے

اسد اعوان/سرگودھا

خواب جلا کر سرمہ کرتے رہتے ہیں
اب ہم اکثر ایسا کرتے رہتے ہیں
آخر کاٹ دیے جاتے ہیں آنگن سے
جیون بھر جو سایا کرتے رہتے ہیں
خدوخال پہ مرنے والے سستے لوگ
اپنی روح کو میلا کرتے رہتے ہیں
کچھ بھی بولیں لوگ ہمارے بارے میں
اپنی طرف سے اچھا کرتے رہتے ہیں
ہم سے تو اک عشق بھی ٹھیک سے ہو نہ سکا
لوگ تو جانے کیا کیا کرتے رہتے ہیں

شبیر نازش/کراچی

ہماری آنکھ کا منظر تلاش کرتے ہیں
بھنور ہے جیسے سمندر تلاش کرتے ہیں
جو کھو گیا تھا ستارے کے ہاتھ سے گر کر
ہم آج تک وہ مقدر تلاش کرتے ہیں
اُمنڈ رہی ہے طبیعت طوافِ جاناں کو
حرم کے پاس ہی محور تلاش کرتے ہیں

خدا نے بھیج دیا آخری رسولؐ مگر
یہ لوگ اب بھی پیغمبر تلاش کرتے ہیں
یہیں کہیں تو ملے گا اسی لیے تو تجھے
ہم اپنی ذات کے اندر تلاش کرتے ہیں
بھٹکتے پھرتے ہیں دن بھر سرائے عالم میں
نڈھال ہوتے ہی بستر تلاش کرتے ہیں
اُلجھ رہے ہیں کہانی کے تار آپس میں
سرا ملے نہ ملے، پر تلاش کرتے ہیں
زباں کی دھار ہی کافی ہے قتل کو ناحق
وہ آستین میں خنجر تلاش کرتے ہیں
جنوں کو دشت میں دیوار گر ملے نہ سحرؔ
تو سر پھرے کوئی پتھر تلاش کرتے ہیں

سدرہ سحرؔ عمران/کراچی

پہلے تو بزم یار میں لایا گیا مجھے
پھر سازشوں سے خود ہی اُٹھایا گیا مجھے
جس سے مرا کوئی بھی تعلق نہ تھا یہاں
فسانہ وہ بار بار سنایا گیا مجھے
تاکہ مرا وجود رہے مرکزی یہاں
مثل چراغ گھر میں جلایا گیا مجھے
منظر جو دیکھنا نہیں چاہتا تھا میں بھی
منظر کبھی کبھی وہ دکھایا گیا مجھے
خاورؔ ڈٹا ہوا تھا میں ظلمت کی راہ میں
دشمن کے ساتھ مل کے ہٹایا گیا مجھے

خاور نعیم بٹ/لاہور

پھر سے خوشبو لٹانے والے ہیں
ہوش سب کے اڑانے والے ہیں

آنے والے ابھی نہیں آئے
جانے والے تو جانے والے ہیں
باغ میں جا کے سکھیوں کے سنگ
گیت ساون کے گانے والے ہیں
جس کو اب تک چھپا کے رکھا تھا
وہ فسانہ سنانے والے ہیں
دھیرے دھیرے سے تیرے ہونٹوں پر
دیپ دل کے جلانے والے ہیں
اُس کو کیسے بتائیں ہم نایاؔ
اُس کی گلیوں سے جانے والے ہیں

نایاؔ سحر/لالہ موسیٰ

جب بھی مجبوری پڑی یار چلا جائے گا
مرا جینا یونہی بیکار چلا جائے گا
بس یہی خوف لگا رہتا ہے ہر پل مجھ کو
میں ہوں اس پار وہ اُس پار چلا جائے گا
مجھ سے لڑنے تو ضرور آئے گا دشمن میرا
رکھ کے قدموں میں وہ تلوار چلا جائے گا
کیا یہ سچ ہے کہ یہ لمحے فسانہ ہوں گے
کیا یہ سچ ہے کہ مرا یار چلا جائے گا
جہاں تک میری کہانی یہ مکمل ہوگی
وہاں تک ہی ترا کردار چلا جائے گا
اُس کو شہزادی نہ اس پار ملی تو اشعرؔ
اب کہ شہزادہ بھی اس پار چلا جائے گا

افتخار اشعرؔ/لاہور

ناول
گھان
سلیم شہزاد
جھوک پبلشر، ملتان

تتلیاں اُڑ گئیں یہ غم لے کر
اب کے پھولوں میں باس کم کم ہے
ابھی مت ٹوٹنا اے خواب میرے
عمران شناور
پہلا شعری مجموعہ
خزینہ علم وادب اُردو بازار، لاہور

مشہور غزلیات کا عہد وار انتخاب
ولی دکنی سے احسان اللہ ثاقب تک
حسن انتخاب: کرامت بخاری، خالد یزدانی
ناشر
کانٹی نینٹل اسٹار پبلشرز، اُردو بازار لاہور

افسانہ

غم کا پچھلا پہر

عذرا اصغر

میں ان دنوں جذبات کے انتہائی مخدوش دور سے گزر رہی تھی۔ ادھر موسم نے بھی احساسات میں عجیب سا انتشار بپا کر رکھا تھا۔ مرگلہ کی پہاڑیوں پر تیرتے بادلوں کے اُجلے اُجلے گالے یکا یک سیاہ کمبل کا بکل مارتے اور بجلی کے لشکارے چمکاتے، دھاڑتے، پھنکارتے چھم چھم برسنا شروع کر دیتے۔ ایسے میں دل میں ایک ٹیس اُٹھتی اور تنہائی کا احساس بڑھ جاتا۔

میری چھبیس سالہ خوشگوار، ہموار اور پُرسکون زندگی میں اچانک بھونچال آ گیا تھا اور ساری کائنات تلپٹ ہو کر رہ گئی تھی۔ اچانک وہ کچھ ہو گیا تھا جس کا تصور بھی کبھی مجھے نہیں آیا تھا۔ بلاشبہ میں ایک جذباتی عورت ہوں اور محبت کو جزوِ زندگی سمجھتی ہوں لیکن مجھے کبھی کسی سے ایسی افلاطونی محبت نہیں ہوئی تھی۔ زندگی کے اس طویل مختصر سفر میں کچھ لوگ ایسے ملے ضرور جو وقتی طور پر اچھے لگے۔ دوست رہے۔ ان کے ساتھ مختلف موضوعات زیرِ گفتگو آئے۔ محبت کا موضوع تو ایسے موقعوں پر خاص اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ مگر میں ہمیشہ اپنا دامن بچا کر نکل آتی رہی۔ میری نظر میں محبت ایک بے حد وسیع المعنی جذبہ ہے جس کے رنگ قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح زندگی پر محیط ہیں اور اسے یعنی زندگی کو خوش رنگ بنائے رکھتے ہیں۔ اس مقدس، خوبصورت جذبے کو مقید یا محدود کرنا مجھے ہمیشہ ناپسند رہا اور محبت کا دعویٰ کرنے والے آگے بڑھ گئے اور اپنی اپنی دنیائیں آباد کر کے پُرمسرت زندگی گزارنے لگے اور میرا ایمان افلاطونی محبت کے خلاف اور بھی پختہ ہوتا چلا گیا لیکن اب جو سانحہ مجھے پیش آیا اس نے میرے ہر احساس اور نظریے کو کچی دیوار کی طرح ڈھا کے رکھ دیا تھا۔

وہ میرے راستے میں دوست بن کے آئی تھی اور میرے گھر میں میری خیر خواہ بن کر داخل ہوئی تھی۔ مگر...... مگر جانے کیسے اس نے میرے شریکِ زندگی کے دل میں رستہ بنا لیا۔ وہ کون سا چور دروازہ تھا جسے میری نگاہیں کبھی دیکھ نہیں پائیں۔

وہ انہیں جیجا جی کہہ کر مخاطب کرتی اور گھنٹوں بیٹھی ان سے محوِ گفتگو رہتی۔ وہ عموماً میرے گھر اس وقت آتی جب عدیل دفتر سے فارغ ہو کر گھر آ چکے ہوتے یا اتوار کا دن ہوتا۔ چھٹی والے دن عدیل دیر تک پلنگ پر پڑے اینڈتے رہنے کے عادی تھے۔ وہ بے تکلفی سے کمرے میں جا کر بیٹھ رہتی۔ میں اُٹھ کر گھر کے کاموں میں منہمک ہو جاتی اور وہ دونوں باتوں میں مصروف رہتے۔ میں وقفے وقفے سے اس کی خاطر مدارات کرتی رہتی۔ کبھی چائے کبھی مشروب...... اب سوچتی ہوں کتنی بے وقوف تھی میں۔ خود سانپ کو دودھ پلا کر پال رہی تھی۔

مجھے نہیں معلوم وہ عدیل سے کیا باتیں کرتی تھی۔ کچن میں کام کرتے ہوئے مجھے اس کے قہقہے سنائی دیتے رہتے۔ جیسے اس کے پیٹ میں کسی نے گدگدی کر دی ہو۔ وہ ایسے ہی بے ساختگی سے ہنستی تھی۔ اس کا قہقہہ بڑا نقرئی سا ہوتا تھا لیکن جانے کیوں جانے کیوں جب وہ بے ساختہ قہقہہ لگاتی تو میرا جی چاہتا کہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں۔ اس کی ہنسی کا گلا گھونٹ دوں۔

بات بے بات قہقہہ لگانا اس کی عادت تھی۔ وہ تین بچوں کی ماں تھی اور ایک اچھے بڑے افسر کی بیوی لیکن شدید اختلافات کے سبب شوہر سے علیحدہ ہو چکی تھی۔ بچے شوہر کے ساتھ تھے اور وہ خود اپنی سہیلی کے پاس رہ رہی تھی۔ وہ اکثر اپنے شوہر کی زیادتیوں کے قصے سناتی اور بعض مرتبہ بے ساختگی سے کہہ اُٹھتی۔

''عائلہ! آخر میری قسمت میں عدیل جیسا شوہر کیوں نہیں تھا؟''

میں اس کی بات کا کوئی نوٹس نہ لیتی اور ہنس کر بات ڈال دیتی۔ کیونکہ وہ کھلے عام بے جھجک بات کرتی تھی۔ کوئی پوشیدگی نہ تھی مگر اس کھلی ڈلی بات کا ادراک مجھے اس وقت ہوا جب عدیل نے مجھ سے کہا۔

''عائلہ! میں شادی کر رہا ہوں۔''

میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے تو انہوں نے کبھی ایسا کچھ نہیں کہا تھا اور اب میں ان کی بات کو مذاق سمجھ رہی تھی لیکن ان کے چہرے پر چھائی سنجیدگی میں مجھے حقیقت کی دستک سنائی دی اور مجھے یکایک یوں لگا جیسے میرا دل چلتے چلتے اچانک بند ہو گیا ہو۔ خشک ہوتے حلق کو لعاب دہن سے تر کرتے کرتے میں نے کہا:

''کیا بکواس ہے عدیل۔ تم جانتے ہو مجھے مذاق میں بھی ایسی باتیں پسند نہیں ہیں۔''

وہ تھوڑی دیر میرا چہرہ دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں ایسی اجنبیت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اسی سنجیدگی سے بولے:

''یہ مذاق نہیں عائلہ! میں فیصلہ کر چکا ہوں اور یہ میرا شرعی حق ہے۔''

''کس سے......؟'' ہمت کر کے میں نے پوچھا۔

''تمہاری دوست صائمہ سے......''

تعجب اور تاسف سے میں کچھ دیر تک کچھ نہ بول سکی۔ پھر فیصلہ کن لہجے میں میں نے کہا۔

''ایک شرط پر......''

''کیا......؟''

''میں بھی اپنا شرعی حق حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے طلاق دے دو۔''

''میں تم دونوں کے خرچے برداشت کر سکتا ہوں۔''

''مگر مجھے اپنی محبت میں بٹوارہ اور شراکت پسند نہیں۔'' شرط منظور کرتے ہوئے انہوں نے چھبیس سالہ رفاقت کا صلہ مکان اور انشورنس سے وصول شدہ معقول رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی اور قبل از پنشن لے کر صائمہ کے ساتھ سعودیہ منتقل ہو گئے۔ چھبیس سالہ رفاقت گویا پل بھر میں اجنبیت میں بدل گئی تھی اور اب میں اس اتنے بڑے سنسار میں اکیلی تھی اور آزاد...... میں نے اپنے بائیس برس کے اکلوتے نوجوان بیٹے کو مزید تعلیم کے لیے کیلیفورنیا یونیورسٹی میں داخلہ دلوا دیا۔ کوششیں تو سب اسی کی تھیں میں تو اس کی صلاح کار تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ باپ کی سرپرستی سے محروم ہو کر کسی بری صحبت میں پڑ کر خود کو تباہ کر لے۔

اس کے چلے جانے سے میں اور بھی تنہا ہو گئی۔ زندگی سے بے زاری اور ڈپریشن میرے لیے مستقل روگ بن گئے۔ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ زندگی کی گاڑی کیسے آگے بڑھے گی۔ میں کہ جو ایک قلمکار تھی مگر اس حادثے کے بعد لکھنا پڑھنا بھی جیسے چھوڑ بیٹھی تھی۔ کچھ کرنے پر طبیعت مائل ہی نہیں ہوتی تھی۔ دوست احباب حتی الوسع دلجوئی کرتے مگر دل کسی طور قرار نہ پاتا۔ ایک عجیب طرح کی بے چینی اور بے یقینی کی کیفیت تھی۔ حیرت تھی چھبیس سالہ رفاقت کیسے پل بھر میں ختم ہو گئی تھی۔ وہ شخص جس سے اب کوئی رشتہ ناتہ نہیں رہ گیا تھا اور جس نے زندگی کی کتاب سے قریباً ساڑھے نو ہزار خوبصورت صفحات نکال دیے تھے اور نئے سرے سے کتاب زندگی کی ابتداء کر چکا تھا لیکن میرے دل پر قابض تھا۔ میرے اعصاب پر سوار تھا اور طلاق کا ٹیکہ میرے ماتھے پر سجا تھا۔ ایسے میں مجھے اپنے موبائل پر ایک میسج ملا۔

اک دوسرے کے کتنے مزاج آشنا تھے ہم
اور پھر بھی اختلاف کی راہیں نکل پڑیں

حیرت...... حیرت سے میں نے بھیجنے والے کا نام پڑھا...... عمران مرزا۔ رانگ نمبر نہیں تھا۔ سوچا کوئی جاننے والا ہے۔ میرے حالات کا ادراک رکھتا ہے۔ میرے ذہن سے شاید نام اُتر گیا ہے۔ جواباً میں نے لکھا:

کچھ اس طرح سے جلایا ہے تپتے سورج نے
کہ اب تو چاند کے نیچے بھی پیاس لگتی ہے

اگلا میسج گویا میرے لیے تحفہ تھی...... مشورہ یہ حضرت علی کا ایک قول تھا:

''اے لوگو! تم گلاب کا پھول بن جاؤ۔ کیونکہ گلاب کا پھول ان ہاتھوں میں بھی خوشبو چھوڑ جاتا ہے جو اسے مسل کر پھینک دیتے ہیں۔''

میں نے اس کی اپنائیت سے متاثر ہو کر حیرانی سے پوچھا:

''مجھے یاد نہیں آ رہا ہے۔ پلیز بتایئے! کیا ہم کبھی کہیں ملے ہیں؟''

''جی نہیں......'' اس کا مختصر جواب تھا۔

''پھر میسج کیوں کرتے ہو؟''

''آپ کو برا لگتا ہے تو نہیں کروں گا۔'' اس کا جواب آیا۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ مگر یہ بتاؤ میرا نمبر کیسے ملا آپ کو؟''

''بس یونہی انگل پچو نمبر گھما رہا تھا۔ صحیح نمبر مل گیا۔''

''کیا آپ کو میرا نام معلوم ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اب مجھے ایک عجیب قسم کا تجسس ہو چلا تھا اور اس سے چیٹنگ کرنے میں مجھے لطف آ رہا تھا۔

''میں نہیں جانتا آپ کون ہیں۔ مرد...... عورت یا......''

''عجیب آدمی ہو۔ بلا جانے بوجھے رسم وراہ بڑھا رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

اس نے لکھا ''میں عرض کر چکا ہوں آپ کو برا لگتا ہے تو آئندہ میسج نہیں کروں گا۔ میرا مقصد ''اچھی باتیں'' دوسروں تک پہنچانا ہے۔ کہیے یہ بری بات ہے کیا؟''

میں نے اسے حضرت علیؓ کا ایک قول بھیجا۔

''لوگوں کی ضرورتوں کا تم سے وابستہ ہونا تم پر اللہ کی عنایت ہے'' اور اس کے ساتھ ہی اسے بتایا کہ میں ایک لکھاری ہوں اور میرا نام عائلہ خان ہے۔ نیز یہ کہ میں ایک عمر رسیدہ عورت ہوں اور میرے ساتھ ٹریجڈی یہ ہوئی کہ میرا جیون ساتھی مجھے مکمل طور پر اپنی ازدواجی زندگی کے چھبیس خوبصورت اور مطمئن سالوں سے نکال کر باہر پھینک گیا ہے۔''

''مجھے آپ سے ہمدردی ہے میڈم۔ تاہم مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ میں CSS کا طالب علم ہوں اور ایک مقامی کالج میں لیکچرر شپ کر رہا ہوں۔ میری عمر پچیس برس ہے اور میڈم! اس اتنی سی عمر میں برسوں پر محیط تجربے کر چکا ہوں۔ دنیا کے بہت سے سرد و گرم سے گزر چکا ہوں۔''

''مجھے تعجب ہوا ہے اور تمہارے حالات سے ہمدردی بھی۔'' میں نے اسے بہت سی دُعائیں دیں۔ اس کی کامرانیوں کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور اسے بتایا کہ تم میرے بیٹے کے ہم عمر ہو جو پڑھنے کے لیے باہر گیا ہوا ہے۔ اب میں اکیلی ہوں اور یہ کہ تم چاہو تو مجھے امی یا آنٹی کہہ سکتے ہو۔''

اس نے کہا ''نہیں میڈم! آپ میری دوست ہیں اور دوستی سے بڑھ کر مضبوط اور مقدس رشتہ اور کوئی نہیں ہوتا اور میڈم! دوستی کے لیے عمر کی کوئی شرط نہیں ہے۔ یہ تو مزاجوں کی ہم آہنگی ہے۔''

عمران مرزا کے میسجز نے میری تنہائی اور میری زندگی کے بوجھل پن کو بہت حد تک دور کر دیا تھا۔ وہ مجھے دن میں کئی کئی میسج کرتا اور دو چار دن بعد فون بھی کر لیتا۔ وہ انگریزی اخبار میں کالم بھی لکھتا تھا۔ دوسروں کے کام آنا اور جیسے بھی ممکن ہو انہیں خوشی پہنچانا وہ اپنا مشن بتاتا تھا۔ قدرے کھلا تو اس نے مجھے اپنی مختصر داستانِ حیات سنائی۔

ابھی نو عمر تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ بڑے بھائیوں نے کفالت سے انکار کر دیا۔ اس نے محنت مزدوری کی۔ ماں کی خدمت کی اور اپنی تعلیم جاری رکھی۔ جب وہ انیس بیس برس کا ہوا تو بھائیوں نے بہلا پھسلا کر ایک بہت دولتمند خاندان کی بتیس سالہ لڑکی سے اس کی شادی کر دی لیکن نباہ نہ ہو سکا۔ لڑکی امیر تھی، جہاندیدہ تھی اور میں نا تجربہ کار بچہ۔ بمشکل یہ اس رشتے سے چھٹکارہ پا سکا۔ اس کے بقول وہ دنیا کے بہت سے نشیب و فراز سے گزر چکا تھا لیکن حالات کی سختیوں نے اسے پر مقصد بنا دیا تھا اور اب وہ مقابلے کا امتحان پاس کر کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہو چکا ہے۔

اور میں اپنا پچھلا غم بھول چکی ہوں۔ اپنے ننھے سے دوست کی وساطت سے میں نے زندگی کا سراغ پا لیا ہے۔ جس نے کڑے وقت میں میرے زخمی دل پر دوستی اور اعتماد کا مرہم رکھا تھا۔ اگرچہ میں آج تک اس سے ملی نہیں لیکن مجھے ہمیشہ یہی لگا جیسے وہ یہیں کہیں میرے آس پاس ہے۔ میرا اور اس کا رشتہ بھی عجیب رشتہ ہے۔ مولانا روم نے شاید اس بے نام رشتے کو ہی ''نالہ نے'' (بانسری کی آواز) سے تشبیہ دی ہے...... اور وہ سب تو میرے غم کا پچھلا پہر تھا جو گزر گیا۔

❀❀❀

مدینے کو دل میرا جانے لگا ہے
محبت کی محفل سجانے لگا ہے
رواں سوئے طیبہ ہے دل دھیرے دھیرے
یہ بستی وفا کی بسانے لگا ہے
حقیقت میں تو ہے یہ اک لوتھڑا سا
مگر مرتبہ کیا یہ پانے لگا ہے
یہ ہے دیدہ ور بے بہا مشکلوں کا
خوشی سے یہ نغمے سنانے لگا ہے
فضا میں مدینے کی بستے ہیں جو بھی
جگہ ایسے لوگوں میں پانے لگا ہے
مجید آج ہے جن کے دم سے یہ دُنیا
یہ اُنؐ کو تصور میں لانے لگا ہے

عبدالمجید چٹھہ/ لاہور

آپ کی نعت سے ہوتے ہیں خسارے پورے
ورنہ یہ کارِ ہنر کارِ زیاں ہے میرا

حسن عباسی/ لاہور

افسانہ

ایک ہی منزل

نازاوکاڑوی

وقی (وقار) نے گھر کے اندر داخل ہوتے ہی گلے سے بستہ اُتار کر پرے پھینکا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نورین نے یوں وقی کو کمرے میں جاتے دیکھا تو سوچا بچہ ہے سکول میں کسی سے جھگڑا ہو گیا ہوگا۔ اسی غصے میں گھر چلا آیا۔ نورین بات جاننے کے لیے وقی کے پیچھے اس کے کمرے میں چلی گئی۔ وقی بیڈ روم پر اوندھے منہ لیٹا رو رہا تھا۔ نورین نے رونے کی وجہ پوچھی۔ جواب نہ پا کر دوبارہ پوچھا:

''کیا ہوا میرے بیٹے کو۔ کیا کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے؟'' وقی اس بار بھی نہ بولا تو وقی کو حوصلہ دیتے ہوئے کہنے لگی ''تو کیا ہوا جب ڈھیر سارے دوست ہوں تو کسی نہ کسی سے جھگڑا تو ہو ہی جاتا ہے۔ آخر تم نے بھی تو کچھ کیا ہی ہوگا نا۔ اتنی سی بات پہ رویا نہیں کرتے۔ چل اُٹھ میرا اچھا بیٹا! منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل۔ میں تیرے لیے کھانا گرم کرتی ہوں۔''

نورین وقی کو سمجھاتے ہوئے واپس جانے کے لیے مڑی تو وقی نے ڈبڈباتی آنکھیں اُٹھا کر ماں کو آواز دی۔ ''ماں جی!''

''جی! میرے بیٹے!'' نورین ممتا بھری محبت سے جواب دیتے ہوئے پھر وقی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ وقی نے ماں کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے سسکیوں کے درمیان پوچھا:

''ماں! میں کب تک جھوٹ بولتا رہوں؟''

''کیسا جھوٹ! خدا نہ کرے تو جھوٹ بولے۔ میں کچھ سمجھی نہیں۔'' نورین وقی کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اس کے معصومانہ رونے پر اُسے پیار آ رہا تھا۔ وہ ایک دم چونک گئی۔ ''ماں! آپ کو تو پتہ ہے میری ہر ماہ فیس لیٹ ہو جاتی ہے۔ کلاس میں ایک میں ہی ہوں جو سب سے آخر میں فیس ادا کرتا ہوں۔ آج بھی ٹیچر نے بھری کلاس میں میری بے عزتی کی ہے۔ ٹیچر کہہ رہے تھے اگر تمہارے ماں باپ کو اتنا ہی شوق ہے کہ ان کا بچہ اچھے سکول میں پڑھے تو فیس باقاعدگی اور وقت کے ساتھ ادا کریں۔ کیا تمہارا ہی ڈرافٹ لیٹ ہوتا ہے اور بھی تو بچے ہیں جن کے باپ تو ہر ماہ ڈرافٹ بھیجتے ہیں ایک تمہارا باپ کہ ہر ماہ ڈرافٹ لیٹ۔ اب تم ہی بتاؤ ماں! میں اپنے باپ کی بے عزتی کیسے برداشت کروں؟''

وقی نے روتے ہوئے تمام باتیں ماں کو سنائیں جو ہر ماہ اُسے سننا پڑتی تھیں۔ نورین پر ایک دم سناٹا چھا گیا اور ٹکٹکی باندھے ننھے وقار کی طرف دیکھتی جا رہی تھی۔ اتنی چھوٹی عمر میں اتنی بڑی بات۔ میں تو سمجھی تھی کسی دوست سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ ہر ماہ باتیں سنتا رہا اور مجھے کبھی نہیں بتایا۔ اتنا صبر! چپ چاپ اپنے اوپر سہے جاتا رہا۔ میں تو من ہی من میں خوش ہوتی رہتی تھی کہ میرا بیٹا شہر کے معروف مدرسے میں تعلیم پا رہا ہے۔ اچھے دنوں کا خواب دیکھا ہے وقار اس کی تعبیر بنے گا۔ کل ایک بڑا آفیسر بنے گا۔ ماشاء اللہ! ذہین لڑکا ہے۔ ابھی تک مسلسل اچھے نمبروں میں پاس ہو رہا ہے۔ آج اس روپ میں دیکھ کر میرا سر اور بھی فخر سے اُونچا ہو گیا کہ اتنی چھوٹی عمر میں اتنی پختہ سوچ کا مالک۔ حالانکہ میں نے کبھی بھی لیٹ فیس ہونے کا سبب ڈرافٹ کی تاخیر نہیں بتایا۔''

وقی جو ابھی تک ماں کے جواب کا منتظر تھا ماں کو یوں حیران اور خاموش دیکھ کر بولا ''ماں! آپ کو کیا ہو گیا ہے آپ جواب کیوں نہیں دیتیں۔ کہیں میری باتوں سے آپ کا دل تو نہیں دُکھا؟''

''نہیں..... نہیں بیٹے نہیں۔''

نورین نے یک دم اپنے آپ کو سنبھالا اور وقی کو زور سے گلے سے بھینچتے ہوئے پیار کیا۔

''نہیں میرے لعل میں تو حیران ہو گئی کہ میرا بیٹا کتنا سمجھدار ہو گیا ہے۔ بڑا ہو کر ضرور افسر بنے گا۔ اپنے ماں باپ کا نام روشن کرے گا۔ تو فکر نہ کر آئندہ تمہاری فیس کو تاخیر نہ ہوگی۔ بس تو پڑھائی کی طرف توجہ رکھ۔ چل اب یہ آنسو پونچھ، اتنے اچھے چہرے پر یہ آنسو بالکل اچھے نہیں لگتے۔'' اور وقی کو گدگدی کر کے ہنسا دیا لیکن وقی نے بھی ماں کی توجہ اُس کے آنسوؤں کی طرف دلائی۔

''بیٹا! یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔'' دونوں ماں بیٹا ہنستے ہوئے کمرے سے نکلے۔

وقی ہاتھ منہ دھونے واش روم چلا گیا اور نورین وقی کے لیے کھانا گرم کرنے کچن میں چلی گئی۔ سالن فرائی پین میں ڈال کر چولہے پر رکھا اور وقی کے بارے میں سوچنے لگی۔ اسے کیا معلوم ہم کس حال میں ہیں۔ تمہیں اپنے بیٹے کا بھی خیال نہیں آیا۔ اگر یہی حال رہا تو کیا مجھے وقار کو سکول سے اُٹھانا پڑے گا۔ کیا میرا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ کیا میری اُمیدوں کا محل ادھورا ہی رہے گا۔ کیا میرے ارمان یونہی مچلتے، سسکتے دم توڑ دیں گے۔ سالن کو اُبلتا دیکھ کر اُس کی آنکھوں سے بھی آنسو اُبلنے لگے۔ نہیں نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ یک بارگی نورین اپنی خیالات سے چونکی۔ میرا خواب ضرور پورا ہوگا۔ میری اُمیدوں

کامحل ضرور بنے گا۔ اپنے ارمانوں کو دم توڑنے نہیں دوں گی۔ اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کے چراغ اپنے خون سے بھی روشن رکھنے پڑے تو پیچھے نہ ہٹوں گی۔ اس سے قبل کہ وقتی کچن میں کھانے کے لیے آتا نورین اپنے تئیں ایک فیصلہ کرچکی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ اُس کے اندر خوداعتمادی کا ایک جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ چند ساعتیں قبل مایوسی اور نا اُمیدی کے بھنور میں گھری ہوئی تھی۔ اب اس فیصلے نے اسے ایک انجانی قوت عطا کر دی تھی۔ اب وہ ہشاش بشاش تھی۔

نورین نے اپنے سسر کو اس فیصلہ سے آگاہ کیا تو وہ خاموش رہے۔ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑ رہا تھا لیکن نورین کے دلائل نے انہیں قائل کرلیا۔

"کاش! میں اس قابل ہوتا کہ کچھ کرسکتا۔ ورنہ آج میں اپنی نظروں میں یوں نہ گرتا۔ تم میرے گھر کی عزت ہو۔ لوگ کیا کہیں گے ہمارے ماں باپ کیا سوچیں گے۔ جب میرا اپنا ہی بیٹا نکھٹو نکلا تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ اب دنیا کچھ بھی کہے" نورین کے سسر نے ہار مانتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں آہ کرتے بات ختم کی۔

"بابا! آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔ بلکہ آپ کو اس بات پر فخر کرنا چاہیے میں حالات سے گھبرا کر ماں باپ کے گھر نہیں گئی۔ ماں باپ کی عزت کے ساتھ مجھے اس گھر کی عزت بھی جان سے پیاری ہے۔ رہی بات دنیا کی تو آج تک اس کے ساتھ کون پورا اُترا ہے؟" نورین نے اپنے سسر کو حوصلہ دلاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے بیٹی! خدا تمہیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔" سسر نے بالآخر نورین کی بات سے اتفاق کیا۔ نورین اپنے طور پر فیصلہ کرچکی تھی کہ کہیں نہ کہیں ملازمت کروں گی۔ گھر کے خرچے کے ساتھ ساتھ میرا مقصد میرا مشن بھی پورا ہو جائے گا۔ ایک روز اخبار میں اشتہار دیکھا کہ چند پڑھی لکھی لڑکیوں کی ضرورت ہے۔ تجربہ، قابلیت ضروری نہیں۔ نورین نے سوچا یہاں کام مل جائے گا۔ مطلوبہ جگہ پہنچی تو اپنی طرح اور بھی بہت سی امیدوار لڑکیاں دیکھ کر حیران رہ گئی اور سوچنے لگی ان بیچاریوں کی کیا مجبوریاں ہوں گی۔ اسی دوران اُس کا نام پکارا گیا۔ ڈرتے ڈرتے آفس کے اندر داخل ہوئی۔ ایک شخص بہت بڑی میز کے سامنے براجمان تھا۔ اُس کی طرف دیکھے بغیر ہی عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھوں کی تیز چمک اُسے اپنے جسم کے اندر داخل ہوتے محسوس ہونے لگی۔ یوں لگا جیسے ایکسرے مشین کی شعائیں میرے جسم کے آر پار ہو رہی ہیں۔ اُسے محسوس ہونے جیسے میں کسی طلسم کدہ میں آ گئی ہوں اور اب میں کسی سحر کی گرفت میں آتی جا رہی ہوں۔ اس سے قبل کہ وہ اس کی آنکھوں کی تیز گرمی سے موم کی طرح پگھل جاتی۔ وہ بھاگ کر باہر نکل آئی۔

آج ریاض کی یاد بھی چلی آئی۔ ریاض کی شدت سے کمی محسوس ہوئی۔ یہ حقیقت ہے عورت مرد کے سہارے بنا کچھ بھی نہیں۔ اس سوکھے پتے کی مانند ہے جسے ہوا اپنے سنگ کبھی بھی کہیں بھی اُڑا سکتی ہے یا پھر کسی کے پاؤں تلے آ کر چڑمڑ ہو جاتا ہے۔ یہ چڑمڑ کی آواز دراصل اس کی موت کے وقت کی چیخیں ہیں لیکن ہم ان آوازوں سے بے خبر پاؤں تلے مسلتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وقتی طور پر اس اچانک افتاد سے گھبرا گئی لیکن پھر اپنے حواس کو مجتمع کیا اور اگلے دن کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا۔ خدا کا شکر ہے ابھی میرے سر پر میرے غمگسار سسر کا سایہ ہے جو مجھے قدم قدم پر حوصلہ دیتا، میری دل جوئی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتا۔ اسی اثناء میں اپنے ہی محلہ میں ایک سکول کا اجراء ہوا۔ اس نے بھی درخواست دی اور بحیثیت محلہ داری اُسے ترجیحی بنیادوں پر منتخب کرلیا۔ آج پھر دھیان ریاض کی طرف چلا گیا۔ کاش یہ سب کچھ ریاض کی طرف سے ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ عورت خواہ کتنا ہی پڑھ لے خود نوکری کرتے ہوئے کتنا بھی کما لے۔ جو خوشی، راحت و تسکین مرد کی کمائی ہوئی رقم سے ہوتی ہے جو وہ مہینہ کے آخر میں بیوی کے ہاتھ پر لاکر دیتا ہے۔ یہ وہی لوگ محسوس کرتے ہیں جن کو یہ شعور حاصل ہے۔ آج باپ کے ہوتے ہوئے بھی ایک ماں کو ملازمت کرنا پڑی۔ باپ مجبور و لاچار ہو تو اور بات ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے پہلی تنخواہ وصول کی تو بہت روئی۔ اس سے زیادہ خوشی تب ہوتی جب یہی رقم ریاض نے بھیجی ہوتی یا لاتا۔ اس کے ساتھ ہی ذہن سے ماضی کا دریچہ کھلا تو ایک ایک پل آنکھوں کے راستے ٹپکنے لگا۔ اس وقت کی بات ہے جب ریاض مہینے کے آخر میں مجھے تنخواہ لاکر دیتا۔ گزارا جیسے تیسے ہو رہا تھا۔ مستقبل کو سامنے دیکھتی تو یہ تنخواہ بہت کم دکھائی دیتی۔ کبھی کبھار ریاض سے اس کا اظہار بھی کر دیتی۔ "ریاض گو میں اس حال میں بھی خوش ہوں لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ تم اس سے بہتر کوئی کام ڈھونڈو جس سے تمہاری تنخواہ زیادہ ہو۔ دیکھو نا آج ہم دو ہیں کل تین ہوں گے پھر...... میرا مطلب ہے ذمہ داریوں میں اضافہ ہوگا۔ اگر ہم ابھی سے ایک منصوبے کے تحت چلیں تو مستقبل میں دشواری نہ پیش آئے گی۔ اچھا سا مکان ہوگا آسائش کی سب چیزیں ہوں گی۔ زندگی کتنی حسین ہوگی۔" وہ ریاض کو قائل کرنے کی کوشش کرتی۔ ریاض مسکرا کر رہ جاتا۔ بات آئی گئی ہو جاتی۔ ایک دن ریاض نے آ کر مجھے خوش خبری سناتے ہوئے کہا "نورین! خوش ہو جاؤ خدا نے تمہاری دعا سن لی۔ تمہاری آرزوئیں پوری ہونے

کے دن آگئے ہیں'' ''وہ کیسے؟''

اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔ ریاض نے جب پوری بات سنائی تو وہ خوشی سے کھل اُٹھی۔ شاید ریاض سے بھی زیادہ۔ ریاض نے بتایا آج بازار میں اچانک میرے ایک ہم جماعت سے ملاقات ہوگئی۔ میٹرک تک ہم اکٹھے پڑھے۔ کالج میں چلا گیا تو وہ باپ کے ساتھ مل کر زندگی کی گاڑی کھینچنے لگا۔ پہلے کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی تھی۔ پھر اچانک سلسلہ منقطع ہوگیا۔ میں نے بھی خاص نوٹس نہ لیا۔ اتنے عرصہ بعد پھر ملاقات ہوئی زندگی کے اس موڑ پر اچانک ملاقات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے دفتر کی کرسیاں توڑ رہا ہوں اور وہ ایک ٹھاٹھ باٹھ میں زندگی گزار رہا ہے۔

باتوں باتوں میں اس نے میرے کام کے بارے میں پوچھا۔ میں نے بے دلی سے سب کیفیت بیان کی جو مجھ پر طاری تھی۔ اس نے خود ہی کہا ہے واپس جا کر میں تمہارے ویزے کا بندوبست کروں گا۔ نورین! مجھے اس پر مکمل بھروسہ ہے۔ وہ یقیناً میرے لیے کچھ کرے گا۔'' ریاض تو تفصیل بتا کر خاموش ہوگیا اور وہ اُس وقت سے آنے والے وقت کا بے تابی سے انتظار کرنے لگی۔ خواب ہی خواب میں کئی بار اپنے آپ کو عالیشان گھر میں پاتی۔ گھر میں نوکرانیاں کام کر رہی ہیں اور وہ انہیں ہدایت دیتے ہوئے اِدھر اُدھر جاتی۔ جب خیالات سے چونکتی تو من ہی من میں مسکرا اُٹھتی۔ اسی دوران وقار کی پیدائش ہوئی۔ ریاض بہت خوش تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بیٹے کی نعمت سے مالا مال کیا تھا۔ اب دولت سے بھی مالا مال ہونے کا انتظار تھا۔ ریاض کے دوست نے وعدہ پورا کر دکھایا۔ ویزا آیا تو نورین نے خوشی خوشی ریاض کی تمام تیاری مکمل کی۔ نجانے اس وقت اُسے ذرا بھی ریاض کے بچھڑنے کا غم نہ ہوا۔ شاید وہ اچھے دنوں کی خوشی کے پیچھے چھپی غم کی تصویر نہ دیکھ سکی۔ پہلے پہل تو باقاعدگی سے محبت بھرے خط اور اچھی خاصی رقم کا ڈرافٹ بھی آتا اور وہ مارے خوشی کے نڈھال ہوئی جاتی۔ کبھی کبھی اپنے سسر کو بھی فخریہ انداز سے کہتی دیکھیں میں نے ہی ریاض کو اس طرف راغب کیا ہے ورنہ ریاض تو ساری عمر یونہی اور یہاں ہی گزار دینا چاہتا تھا۔ بابا بھی میری اس بات پہ مسکرا دیتا تو نہ نجانے یہ مسکراہٹ مجھے اچھی نہ لگتی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا بابا میری بات کا مذاق اُڑا رہے ہیں لیکن اس کے باوجود میں پرواہ نہ کرتی۔ کچھ ہی عرصہ بعد خطوں کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا۔ میں تشویش ظاہر کرتی تو جواب میں کام کی زیادتی بتاتے۔ آج کل اوور ٹائم چل رہا ہے خط لکھنے کا وقت نہیں ملتا۔ میں خوش ہو جاتی اور میری سوچوں کی اُڑان اور بھی تیز ہونے لگتی۔ کوئی بات نہیں جتنا زیادہ کام کریں گے اتنے زیادہ اور جلدی سے پیسے اکٹھے ہوں گے۔ یوں ہم جلد خوش حال ہو جائیں گے لیکن کیا خبر تھی کہ اتنی اُونچی اُڑان سے گر کر چکنا چور بھی ہو جاؤں گی۔ آخر وہی ہوا جو اُونچی اُڑان والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ غم کی تیز ہوا کے سامنے نورین کے پر بے بس ہوگئے اور وہ دھڑام سے نیچے آ گری۔ آرزوؤں کا محل چکنا چور ہوگیا۔ اُمیدیں اور تمنائیں مٹی میں مل گئیں۔

اسی دوست کی زبانی پتہ چلا چونکہ وہاں ماحول آزاد ہے۔ عورت مرد اکٹھے کام کرتے ہیں اسی دوران ایک ساتھی عورت سے شناسائی ہوگئی۔ میں نے اُسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن ریاض اس قدر آگے بڑھ چکا تھا کہ واپس آنا مشکل تھا۔ اب تو اُس نے باقاعدہ اس عورت کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ میں زیادہ زور بھی نہ دے سکا۔ مبادا دوست کے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ ویزہ بھیج کر مجھے تنگ کر رہا ہے یا شاید میں اس کے لیے برا سوچ رہا ہوں۔ وہ اتنا سن کر بھی خاموش رہی۔ اس لیے کہ ان سب حالات کی ذمہ دار وہ خود تھی۔ اس نے ہی اچھے دنوں کی اُمید پر اپنے ریاض کو قربان کیا۔ جب آمدن کم تھی تو ریاض میرا تھا۔ دھن زیادہ ہوا تو ریاض دور ہوتا چلا گیا۔ اب تو نہ دھن رہا نہ ریاض ہی، نہ جانے مرد اتنا خودغرض کیوں ہے۔ برے دنوں میں تو بیوی کے ساتھ رہتے ہیں اچھے دنوں کے آتے ہی پرانا ساتھی کسی پرانی چیز کی مانند ناکارا ہو جاتا ہے۔ کیا اچھے دنوں میں پرانے ساتھی کا کوئی حق نہیں۔ انہیں ان مشکلات کا صلہ کوئی نہیں دیتا۔ جب وہ مشکلات میں برابر کا شریک ہوتا ہے مرد کو اپنی عیاشی اور طبع تفریح کے لیے ہزاروں راستے نکال لیتے ہیں اور عورت بیچاری تقدیر کی ماری سسکتی رہتی ہے۔ گیلی لکڑی کی طرح آہستہ آہستہ جلتی ہے۔ انجام خاک ہو کر غم کی تیز آندھیوں میں تحلیل ہو کر رہ جاتی ہے۔ کبھی عورت اور مرد ایک گاڑی کے دو پہیے کہا جاتا تھا۔ آج کے جدید دور میں گاڑی ایک ہی پہیئے سے چل رہی ہے۔ اس جیسی نہ جانے کتنی حالات کا شکار اپنے ناتواں ہاتھوں سے زندگی کی گاڑی کھینچے جا رہی ہیں۔ گاڑی کے خراب پہیئے کی طرح پہیہ تبدیل بھی کر لیا جاتا ہے۔ جیسے وہ ایک ہی پہیہ سے زندگی کی گاڑی کھینچنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس سے پہلے کہ ریاض میں گاڑی کھینچنے سے معذور ہو جاؤں میں چاہتی ہوں میرا ساتھ دو۔ جس منزل کے لیے ہم نے مل کر سفر شروع کیا تھا اسے مل کر ہی طے کریں ریاض منزل ہمیں پکار رہی ہے۔ راستے میں ملنے والے راہی منزل تک ساتھ نہیں دیتے۔ تم اپنی منزل کے مسافر ہو وہ کسی اور منزل کے۔ تم شاید راستہ بھول گئے ہو۔ پھر بھی چلے آؤ۔ راستہ تمہیں میں بتاؤں گی۔ منزل ہماری منتظر ہے۔ اپنا راستہ ایک، ایک ہی منزل، وہ ہے وتی۔

افسانہ

محبت رو رہی تھی

شہزاد ملک/لاہور

دوپہر کا وقت تھا۔ سورج اپنی مستی میں ہولے ہولے منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ دریائے ستلج کی سوہنی ریت اپنے مہینوال پانی کے انتظار میں ہوا کے اشاروں پر یہاں سے وہاں ناچ رہی تھی۔

دریا کے کنارے ''مراد سائیں'' کے چھوٹے سے دربار کے اردگرد درختوں کی آبادی تھی۔ کوؤں اور درختوں کے درمیان اک بحث کا سماں تھا۔ کوے شور مچاتے ہوئے کبھی اس درخت کی شاخ پہ بیٹھتے تو کبھی اُس درخت کی۔

اکثر گاؤں کی عورتیں اپنے چھ ماہ کے بچے کو کوؤں کا جوٹھا پانی پلانے کے لیے یہاں آتی تھیں۔ مشہور تھا کہ کوے کا جوٹھا پانی پینے سے بچہ جلد بولنا شروع ہوا اور گونگا بھی نہیں ہوگا۔

یہاں ہر طرف امن وسکون کا راج تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں محبت محلوں، رسموں رواجوں اصولوں سے اُکتا کر چاندنی راتوں میں آرام کرنے آتی تھی۔

ایک ایسی ہی رات تھی جب میں محبت سے ملا تھا۔ درختوں کی شاخوں سے آنکھ مچولی کھیلتا ہوا چاند مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اچانک میری نظر محبت پہ پڑی۔ وہ بھی شاید سکوں کی متلاشی تھی۔ کھلی زُلفیں آنکھوں میں اعتماد اور پورا جسم سادگی کا اک شاہکار تھا۔ اپنے آس پاس سے بے خبر نجانے وہ کن سوچوں میں گم تھی۔ جب ہلکی ہلکی پو پھٹنے لگی اور درختوں پر پرندوں نے انگڑائیاں لینا شروع کیں تو وہ چلی گئی۔

میں اکثر ایسی راتوں میں اس کا انتظار کرنے لگا تھا۔ ایک رات اُسے بھی میری موجودگی کا احساس ہوگیا۔ میرے قدم اُس کی طرف بڑھنے لگے۔ نظر نظر سے ایسی ملی جیسے چودھویں کے چاند نے سمندر میں جھانکا ہوا اور اپنی چاندنی اُس میں سمودی ہو۔

بس وہی لمحہ تھا کہ مجھے کائنات کے ذرّے ذرّے سے محبت ہوگئی۔ اسی رات دل کی زمین پر اک نومولود بچے کی طرح خوابوں نے آنکھیں کھولنا شروع کیں۔ معصوم خواب، بالکل اک چھوٹے بچے کی طرح کے خواب جن کی نشوونما صرف محبت تھی۔ محبت کا احساس تھا۔

میں اکثر اُس کا انتظار کرنے لگا تھا مگر کئی راتیں گزریں وہ نہ آئی۔ اک شب جب چاند بھی کہیں چھپا ہوا تھا تو وہ ننھے ننھے تاروں کی روشنی میں درگاہ تک آئی۔

ڈری ہوئی سہمی سی...... خاموش نگاہیں......

خشک ہونٹوں سے اتنا بولی:

''میں اک عزت دار ماں باپ کی بیٹی ہوں اور میری جاگیر میری عزت ہے۔ پرانی رسموں اور بوڑھے ہاتھوں کے آگے مجبور بھی ہوں اور نہیں بھی......!

اپنی پلکوں پہ ایسے خواب نہ سجا لینا کہ کہیں زمانے والے تمہاری آنکھوں میں میرا نام نہ پڑھ لیں۔ وہ چلی گئی مگر محبت کا ہر پل اپنے ساتھ ہونے کا احساس آج بھی زندہ ہے۔ وہ میرے اندر سما گئی اور مجھے کائنات میں موجود ہر شے سے محبت ہوگئی۔ وقت سانپ کی طرح اپنی کھال بدلتا رہا۔ میں پرانی یادوں کی اٹیچی کھولے بیٹھا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو! مبشر کہاں کھوئے ہوئے ہو؟ فیس بک پر Online بھی ہو اور کسی میسج کا جواب نہیں دے رہے۔ آخر کس کے ساتھ بزی تھے؟''

''اوہو...... ہاں ناہید کیسی ہو تم......؟''

''میں ٹھیک ہوں۔ کل کیونکہ سنڈے ہے میں سوچ رہی تھی کہ آپ اور میں کہیں آؤٹنگ پہ چلیں۔ ویسے بھی کچھ بات کرنی تھی آپ سے......''

''اوکے ٹھیک ہے میں آجاؤں گا۔''

''اوکے تھینک یو مبشر...... ٹیک کیئر''

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔ یہ ٹریفک کا شور کیوں ہوتا ہے۔ ٹیکنالوجی اتنی ترقی کر گئی ہے تو اس ٹریفک کے شور کو شور نہیں بلکہ ٹریفک میوزک ہونا چاہیے تھا۔ خوشگوار میوزک...... میری گاڑی موٹر سائیکل سواروں کے درمیان ایسے پھنسی ہوئی تھی جیسے فلموں میں غنڈے ہیروئن کو گھیرے ہوئے ہوتے ہیں جیسے ہی سنگل گرین ہوا موٹر سائیکل سوار ایسے کٹ مارتے ہوئے گزرے جیسے کچھ منچلے لڑکے لڑکی کو چھیڑتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

میں نے ناہید کو اُس کے گھر سے پک کیا اور ہم دریائے راوی کی طرف چلے گئے۔

''مبشر میں نے کچھ کہنا تھا آپ سے......''

''ہاں کہو ناہید......''

''وہ مبشر......I love you''

''یہ کیا کہہ رہی ہو ناہید؟ کیا تم جانتی ہو میں محبت سے ملا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ وہ چلا رہی تھی۔ مجھے ان تین لفظوں میں قید مت کرو۔ وہ چلا رہی تھی۔ ان تین لفظوں کے سہارے مجھے بدنام مت کرو۔ محبت کے جسم پہ شکایتوں کے زخم تھے۔

''شٹ اپ مبشر...... یہ کیا اول فول کہہ رہے ہو تم...... کیسے مل سکتے ہو تم محبت سے؟''

''میں ایک لڑکی سے ملا تھا۔ وہ بہت اُداس بیٹھی تھی۔ باتوں باتوں میں اُس نے بتایا کہ تین لفظوں نے اُس کی زندگی بدل دی۔ فیس بک پہ ایک لڑکے سے اُس کی دوست ہوئی۔ آہستہ آہستہ یہ دوستی کی جڑیں محبت کے درخت کی شکل اختیار کرگئی۔ مگر وہ لڑکا اُس سے ٹائم پاس کرتا رہا۔ وہ لفظوں کا کھلاڑی تھا۔ وہ اس لڑکی سے اپنا ہر ناجائز مطالبہ پورا کروالیتا تھا۔ حتیٰ کہ اُس نے لڑکی سے کہا کہ جتنا بھی زیور گھر میں ہے چوری کرو اور مجھے دے دو۔ میں کوئی کاروبار شروع کروں گا اور اس طرح تمہارا رشتہ بھی جلدی مل جائے گا۔ مگر وہ لڑکی نہ مانی تو اُس نے انہی تین لفظوں کا سہارا لیا اور زیور ملنے کے بعد اسے چھوڑ کے چلا گیا۔

اوہو مبشر چھوڑو یہ باتیں۔ یہ اُس لڑکی کا معاملہ ہے ہمیں اس سے کیا لینا......

''مبشر! I love you''

''ناہید میں محبت سے ملا تھا۔''

''مبشر پھر وہی بات۔'' وہ اُکتاتے ہوئے بولی۔

''تو اب کی بار کیا کہا محبت نے؟''

محبت آزادی چاہتی ہے۔ وہ چلا چلا کے کہہ رہی ہے مجھے ذات پات، رنگ نسل، امیری غریبی، خاندان برادری کے فرق، رسموں رواجوں کی باندی نہ بناؤ۔ محبت مر رہی ہے۔

''کیا مطلب مبشر میں کچھ نہیں......؟''

میں ایک لڑکا اور لڑکی سے ملا تھا۔ وہ دونوں زمانے کے ستائے ہوئے تھے۔ وہ عجیب کشمکش میں تھے۔ ایک طرف والدین تو دوسری طرف ان کی پاکیزہ محبت۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں مگر ان کے والدین ان کی شادی کے خلاف ہیں۔ وہ دونوں بھاگ کر شادی تو کر سکتے تھے مگر وہ محبت کو یوں رُسوا نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی ایک دوسرے کو چھوڑنے پر راضی تھے۔ بس وہ ایک ساتھ مرنا چاہتے تھے تاکہ آئندہ والدین کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ذرا سوچیں ضرور۔''

''بھاڑ میں جائیں وہ دونوں......'' وہ زچ ہوتے ہوئے بولنے لگی۔

''مبشر میں تمہارے لیے اپنے والدین کو بھی چھوڑ سکتی ہوں۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو ناہید؟ ایسے تو ایک دن تم مجھے بھی چھوڑ دو گی۔'' وہ غصے سے مجھے گھورنے لگی۔ ناہید میں محبت سے ملا تھا وہ رو رہی تھی۔

''عجیب بکواس ہے۔ مبشر میں نے کئی ناولوں میں پڑھا ہے، ڈراموں میں دیکھا ہے سنا ہے محبت روتی نہیں رُلاتی ہے اور تم کہہ رہے ہو خود محبت رو رہی ہے۔ مگر کیسے بتاؤ مجھے مبشر!! سخت سردی کی ایک رات تھی میں نے فٹ پاتھ پہ ایک بوڑھی عورت کو دیکھا تھا۔ وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔

آنکھوں میں نمی اور لبوں پہ دعا تھی۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ جس اولاد کو پال کر جوان کیا ان کی شادیں کیں مگر ایک دن انہوں نے اسے اس گھر سے نکال دیا جس گھر کی دیواروں کو اُس نے محنت، صبر اور محبت کے گارے سے بنایا تھا اور اُن دیواروں پہ اُمیدوں کا پینٹ کیا تھا۔ جس اولاد کے لیے اُس نے دن رات محنت مشقت کی وہی اولاد آج اُسی گھر میں اس کی کھانسی کے شور کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ماں تھی۔ محبت کی انتہا تھی۔ وہ رو رہی تھی مگر اُس کی آنکھوں میں نہ کوئی گلہ تھا اور نہ ہی نفرت لیکن وہ پھر بھی اپنی اولاد کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔

اوہو...... بس کرو مبشر۔ مجھے لگتا ہے تم ابنارمل انسان ہو۔

شکر ہے مجھے وقت سے پہلے پتہ چل گیا۔ مگن رہو تم اپنی اس فلسفی دنیا میں۔ اگر تمہیں فیس بک پہ اور لڑکیاں مل جائیں گی تو مجھے بھی کوئی کمی نہیں۔

اوکے...... وہ جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ میں نے اُسے پکارا۔ میری ایک بات سنتی جاؤ ناہید۔ محبت کو صرف تین لفظوں میں قید مت کرو۔ لفظوں کی مالا میں اگر جذبوں کے پھول پروؤ گی تو ان سے محبت کی خوشبو آئے گی۔ وہ چلی گئی۔ مگر اُس کے جانے کا مجھے کوئی دکھ نہیں ہوا۔ کیونکہ محبت اُس کی زباں پر تو تھی مگر آنکھوں میں محبت کے جذبات نہیں تھے۔ میری حالت اُس سڑک کے جیسی تھی جس پہ دن میں تو بہت گہما گہمی رہتی ہے مگر رات کے وقت وہ اک اُجڑی ہوئی بیوہ کی طرح لگتی ہے۔ مگر پرسکون......!

رُوسی عورت کے شب و روز

سلمیٰ اعوان

انتونینا کا پورا چہرہ کیا اُس کا تو ہر نقش کھلے گلاب کی طرح ہنس رہا تھا۔ دروازہ اُسی نے کھولا تھا اور ہمارا استقبال اُس پرخلوص پاکستانی کی طرح سے کیا تھا جو بیرون وطن مقیم اپنے کسی غیرملکی دوست کو پاکستان آنے اور اس کے کسی اہم شہر اور جگہوں کی سیاحت سے واپسی پر کھلے بازوؤں سے کرتا ہے۔ اشتیاق بھری آنکھوں سے مسکراہٹ ہونٹوں سے سوال جواب کے سلسلے۔ میں اس سلوک کی یقیناً متوقع نہیں تھی۔

ہاں تو کیا کیا دیکھا؟

وہ ہمارے جواب تو کم سنتی تھی۔ سوال پہ سوال کیے چلی جاتی تھی۔ ایڈمیرلٹی کی سیر کی۔ جواب نفی میں تھا۔ بوٹینیکل گارڈن دیکھے۔ اُس کی لائبریری میں گئیں۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی لائبریری ہے۔ سر کا تو لا پھرتی میں ہلا

"اُف وہاں تو جانا تھا۔"

"انتونینا کہاں کہاں جاتے؟ اتنا کچھ تھا وہاں کہ ہماری تو مت ماری گئی۔"

"اچھا چلو انستاسیا سے ملاقات تو بہت اچھی رہی ہوگی۔ میری بات ہوئی تھی اُس سے۔"

ظاہر ہے ہمارے پاس اُن کے لیے محبت بھرے جذبات تھے۔

چھوٹی کرسی پر بیٹھا میرنوف چھوٹی سی میز پر رنگوں کو بکھیرے ڈرائنگ بورڈ پر پھولوں میں رنگ بھر رہا تھا میں پاس جا کر بیٹھ گئی تھی۔ انتونینا بولی۔

"کیا کروں؟ ایسی فضول ڈرائنگ کرتا ہے۔ اُوپر سے رنگ بھرنے کی بھی تمیز نہیں۔"

میں ہنس پڑی تھی۔ پورب ہو یا پچھم اُتر ہو یا دکھن۔ ماؤں کی نفسیات بہت حد تک ایک سی ہوتی ہے۔ پہلے بچے پر تو بس نہیں چلتا کہ کیسے اُسے پی ایچ ڈی کروا دیں۔ مجھے بیٹی اور بہو دونوں یاد آ گئی تھیں۔ مار ہلکان ہو ہو جاتی ہیں۔

انتونینا نے بتایا تھا کہ یکم ستمبر کو سکول کھلتے ہیں۔ بچے اپنی ٹیچر کے لیے پھول لے کر جاتے ہیں۔ میں کہتی تھی کہ اس بار تم تازہ نہیں خود اپنے ہاتھوں سے تیار کردہ پھول لے کر جاؤ گے۔ چلو ڈرائنگ اور کلرنگ تو اس بہانے کچھ بہتر ہو جائے گی۔

میں ابھی دلداری کے لفظوں سے اُسے بہلا رہی تھی جب بیل بجی۔ انتونینا کی ماں اور باپ دونوں اندر داخل ہوئے۔ ماں کا چہرہ اس درجہ درہم برہم سا تھا کہ تھوڑا سا خوف محسوس ہوا۔ اُس نے کاغذات کا بڑا سا پلندہ انتونینا کے آگے پھینکا اور کسی بپھری شیرنی کی طرح شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولنا شروع ہوگئی۔ باپ بھی بولنے لگا۔

میرا تو دم ہوا ہو گیا۔ انتونینا نے بھی غصے سے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہا۔ تھوڑی دیر تک کمرہ پانی پت کا میدان بنا۔ پھر دونوں بول برار کرتے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

بڑی مخدوش اور نازک سی صورت تھی۔ ہماری تو بھیگی بلی کی طرح چھپنے والی بات تھی۔ پر یہ امر قابل اطمینان تھا کہ انتونینا مزے سے بیٹھی ایکسرے رپورٹیں دیکھتی تھی۔

ساری چیزیں اس نے بڑے سے لفافے میں ڈال کر سمیٹیں اور ہماری طرف دیکھا جو ذرا پریشانی سے اُس کی طرف ہی دیکھتی تھیں۔

"جگر کا ستیاناس ہو گیا ہے۔ دل کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔ الکحل پر ہی بات نہیں۔ ہیرلوشن بھی پی لیتا ہے۔ کارمن پرفیوم کے بھی چسکے لیتے ہیں۔ اب گلا اور جگر تو کٹتے ہیں نا۔ کام سے بھی بھاگ آتا ہے۔ نوکری بھی نہیں اور شراب کی جان نہیں چھوڑنی۔ پیسہ ٹکا کمانا نہیں۔ صبح آٹھ بجے سے شام چھ بجے تک کام کرنے والی اور گھر کو چلانے والی عورت بولے گی نہیں تو اور کیا کرے گی؟

میں نے آنکھیں اُٹھا کر اپنے سامنے دیکھا۔ سفید دیوار جس پر تھوڑی سی دیر قبل کا دیکھا ہوا سین رقص کرنے لگا تھا۔

یہ رُوس ہے۔ پر منظر تو بڑا اپنا اپنا سا ہے۔

چائے کی ٹرے یانینا انتونینا کی چھوٹی بہن نے میز پر رکھی اور بہن سے کچھ کہا۔ بڑی نے قدر خفگی سے بایاں ہاتھ کانوں کے پاس لے جا کر

جھاڑنے والے انداز میں لہرا دیا۔ چائے کا چھوٹا سا گھونٹ بھرتے ہوئے میں نے کہا۔

''انتونینا رُوسی عورت میرے مشاہدے کے حسابوں بڑی محنتی ہے۔ کولہو کے بیل کی طرح کام کرتی ہے۔ مرد خاصی موج میں ہیں۔''

سالوں پہلے جب میں پاکستان میں تھی۔ ایک گانا میرے سسر کے گھر میں بہت کثرت سے بجا کرتا تھا۔ میرے سسر کا پسندیدہ۔ پہلے میں نے توجہ نہیں دی۔ جب تسلسل سے بول کانوں میں پڑے تو اپنی نیند سے اُس کا مطلب پوچھا۔

عمراں لنگیاں پباں بھار۔

بس تو سمجھو کہ رُوسی عورت بھی زندگی پباں بھار ہی گزارتی ہے۔ آٹھ گھنٹے کی روزانہ کام کی ڈیوٹی اور پھر چھ آٹھ گھنٹے گھر کی ذمہ داریاں۔

''اب مجھے دیکھو۔ اماں کی مثال تو بعد میں دوں گی۔ میں جدید رُوسی عورت کی نمائندہ ہوں۔ مڈل کلاسی، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کم و بیش آدھی دنیا گھومی ہوئی۔ کام پر جانے کے لیے مجھے پبلک ٹرانسپورٹ، کبھی بس، کبھی ٹرام، کبھی ٹرالی بس اور کبھی میٹرو سے سفر کرنا پڑتا ہے۔ وقت کے اعتبار سے ہی فیصلہ کرتی ہوں کہ کون سا موڈ مجھے کام پر جلدی پہنچائے گا۔ میرے اوقات کار شکر ہے رش والے نہیں ہیں۔ وگرنہ سویرے سویرے حشر ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ڈربے میں مرغیاں یا کین میں مچھلیاں ٹھنسی ہوئی ہوں۔''

کام پر کام کی دردسری۔ اب ہمارے پاس گاڑی ہے۔ یہ گاڑی تھوڑا عرصہ پہلے ہی لی تھی۔ مگر بالعموم یہ منصور کے پاس ہوتی ہے۔ مڈل اور لوئر مڈل کلاسیوں کے پاس گاڑیاں بہت کم ہوتی ہیں۔ اگر گاڑی ہے تو زیادہ تر شوہر کے پاس ہی ہوگی۔

کام سے واپسی پر مجھے راستے میں پڑنے والی کسی دوکان پر رُکنا ہے۔ اپنے پرس میں سے تھیلا نکالنا ہے دودھ، ڈبل روٹی، انڈے، پھل اور دیگر روزمرہ ضروریات کی چیزوں سے بھروا کر اُسے اُٹھانا بھی ہے۔ پہلے جب اکیلی تھی تو کنڈر گارٹن سے بیٹے کو بھی لیتی تھی۔ چلو اب کوئی نہ کوئی اُسے لے آتا ہے۔

اب دوسرا رُخ دیکھو۔

منصور کے کزن کی بیوی اَپر کلاس سے ہے۔ کچھ تو اُس کا بھائی تیز، کچھ بیوی کی پشت پناہی۔ اُس کا کاروبار بہت عروج پر ہے۔ کہیں کام نہیں کرتی۔ دو بچے ہیں۔ ماسکو کے ٹاپ سکول میں پڑھتے ہیں۔ بریک فاسٹ سے لنچ تک سکول میں۔ اب وہ ایلیٹ کلاس کی عورتوں کی طرح گیارہ بارہ بجے تک بیڈ پر اینڈھتی ہے۔ تو بھئی یہ اُس کا مقدر۔

یہ گھر ابا کا ہے۔ میرے ابا پکے کیمونسٹ اور سچے انقلابی تھے۔ ٹکے کی ہیرا پھیری کو بھی حرام سمجھتے تھے۔ پھر یار لوگوں کی دیکھا دیکھی ہاتھ پیر مارے۔ جب سوویت ٹوٹا اور آپو دھاپی پڑی تو اس گھر کو تو انہوں نے بغیر ڈکار مارے ہضم کر لیا اور بھی چکر چلائے۔ یہ دور لوٹ کھسوٹ کا تھا۔ شریف لوگ رگڑے گئے۔ بدمعاشوں اور زبردستوں نے جو جو سمیٹ سکتے تھے سمیٹ لیا۔ نہ کہیں شنوائی اور نہ کہیں دادرسی۔

لیکن ایک فائدہ ضرور ہوا کہ جب غیر ملکی اشیاء خریداری کی دسترس سے بالا ہو گئیں رُوسی صنعتیں میدان میں اُتریں اور انہوں نے مارکیٹ کو قابو کر لیا اور اس چیز نے ملکی معیشت کو بہت سنبھالا دیا۔

یقین کیجیے رُوسی عورت جب گھر آتی ہے تو وہ انگریزی کے لفظ اگیزاسٹڈ Exhausted کی مکمل تصویر نظر آتی ہے اور میں خالی کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے خود سے کہتی ہوں۔

اب یہ دونوں عورتیں رُوس میں اگر ہیں تو پاکستان میں بھی ہیں اور دیگر ممالک میں بھی تھوڑے بہت کلچرل فرق کے ساتھ۔

اب رات کے کھانے کی تیاری کا مرحلہ درپیش۔ نیم پختہ چیزوں کی بہت افراط ہے لیکن وہ زیادہ تر درآمد شدہ ہونے کی وجہ سے باوا کے مول ہوتی ہیں۔

شوہر کا کردار دیکھ لیں۔ منصور کے کام کی نوعیت ایسی کہ وہ بالعموم رات کو دس سے پہلے نہیں آ سکتا۔ وہ میری مدد کپڑوں کی دھلائی اور گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں ہی کرتا ہے۔

یہ تو گھر سے گھر تک کے مناظر ہیں جو میں دیکھ رہی ہوں۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

ایک عام رُوسی عورت کی زندگی کام، گھر، کام، گھر دوکان، گھر۔ اب کہا جا سکتا ہے یہی زندگی مغربی عورت کی بھی ہے۔ مگر نہیں۔ فرق ہے سسٹم کا۔ یہ جو مثل مشہور ہے کہ مغربی زندگی کے فلسفے کی بنیاد فرد کی زندگی کو آسان اور پر لطف بنانے پر رکھی گئی ہے جبکہ رُوسی زندگی کی ''خدا

مشقت جھیلنے کا حوصلہ اور ہمت دے'' پر ہے۔ سو فی صد سچ ہے۔ انتونینا کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

ایک واقعہ سنیں۔ میری دوست ایوگینیا کاسمٹکس کی ایک غیر ملکی فرم میں کام کرتی ہے۔ کمپنی نے اُس کی تنخواہ میں سے وہ دن کاٹ لیا جس دن وہ اپنے نئے باس کے لیے معلومات ا کرنے کسی حکومتی ادارے میں گئی۔ اب اُس کا یہ اصرار کہ اُسے ڈیوٹی پر سمجھا جائے اور باس کا کہنا کہ ہرگز نہیں۔ یہ معلومات تو تمہیں دفتر بیٹھے ایک فون یا فیکس پر حاصل ہو سکتی تھیں۔ یقیناً تم نے اپنے کسی ذاتی کام کے لیے یہ ہیرا پھیری کی ہے۔

اب وہ بھی جانتی تھی۔ میں بھی اور فرم کا پرانا باس بھی کہ ایک کال پر معلومات کا ملنا یورپ میں تو ممکن ہے رُوس میں ناممکن۔ جب تک دفتر خود نہ جاؤ اور ہر ڈیپارٹمنٹ میں بھاگ دوڑ نہ کرو کام نہیں ہو سکتا۔

یقیناً اُس وقت میں نے خود سے کہا تھا تو میں اپنے وطن کو کس نمبر پر کھڑا کروں۔ یہ نمبر تین تھا۔ کام تو چٹکیوں میں ہو جاتا ہے بس لال ہرے نوٹ نیچے سے اُوپر تک اگر گردش کریں یا پھر کوئی تگڑی سفارش پشت پر ہو۔ پر نوٹوں والی بات تو بہت پکی ہے۔

انتونینا نے وقت دیکھا۔ مجھ سے معذرت کرتے ہوئے باہر چلی گئی۔ مہر النساء صوفے پر بیٹھی اُونگھ رہی تھی۔ میں سیمر نوف سے اونگی بونگی باتیں کرنے لگی۔ بچہ نہ ابھی انگریزی اتنی سمجھتا تھا نہ اُردو۔ یہ گھلنے ملنے والا پر اعتماد بچہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد انتونینا کمرے میں آئی۔ ایپرن پہنے سر کو سکارف نما کپڑے سے باندھے۔ مجھے اُٹھا کر کچن میں لے آئی کہ میں کھانا بھی بنا لوں اور باتیں بھی کرتے ہیں۔ میز پر سیب اور کیلے دھرے تھے۔ ایک پلیٹ میں کانٹے چمچ کے ساتھ کچھ تھا۔ انتونینا نے کہا اسے کھائیں۔ یہ کھٹی میٹھی چٹنی میں لوبیا ہے۔ بہت مزیدار چیز ہے۔ ہم بہت کھاتے ہیں۔ واقعی جب میں نے چمچ منہ میں ڈالا مزہ آ گیا۔ وہ پیاز کاٹ رہی تھی اور میں چسکے لیتی لوبیا کھا رہی تھی اور اس سے کہتی تھی۔

''انتونینا رُوسی لڑکیاں بہت اچھی بیویاں ہوتی ہیں۔''

یقیناً اس میں کوئی شک نہیں۔ یورپ میں رُوسی بیویاں پسندیدہ ترین شمار ہوتی ہیں۔ سوویت زمانوں میں تو بہت بھولی اور سادہ ہوتی تھیں۔ آسانی سے مردوں کے جال میں پھنستی تھیں۔ پر ذرائع ابلاغ کی آزادیوں نے خاصا ہوشیار کر دیا ہے۔ تاہم پھر بھی گھر بچانے کو ترجیح دیتی ہیں۔ ایک بات بڑی زبان زد عام ہے۔

''رُوس میں کیا سب سے اچھا ہے؟''

رُوسی لڑکیاں۔

خوبصورت، مذہب، سادہ اور آسانی سے گرفت میں آنے والیاں۔ رُوسی لڑکیاں جلدی شادی کرنا پسند کرتی ہیں۔ تعلیم کی تو خیر کچھ پروا کر ہی لیتی ہیں۔ پر کیریئر کے لیے بالکل سنجیدہ نہیں ہوتیں۔ زیادہ عمر اگر ہو جائے تو اس کا سیدھے سیدھے مطلب ہے کہ لڑکی کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہے۔ سیکس کا مسئلہ بہت ثانوی ہے۔ ہماری زندگیوں میں اُس کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ شراب کی طرح معمول کی بات ہے۔

اب پاکستان میں کیا ہے؟ یہی کام لڑکیاں چوری چھپے کرتی ہیں۔

انتونینا کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ کتنا عرصہ پاکستان میں رہی؟ آٹھ نو ماہ۔ پاکستانی معاشرت کے سارے کچے چٹھوں سے شناسا ہو چکی تھی۔

اور جب میں نے ہنستے ہوئے یہی بات کہی۔ تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔

''لکھنے والے کی ایک آنکھ زیادہ ہوتی ہے۔''

اس رات واپسی دیر سے ہوئی۔ منصور کا چھوٹا سا خاندان جب ہمیں ہوٹل چھوڑنے آیا ایک بج رہا تھا۔

نعت

دہلیزِ مصطفیٰؐ پہ اگر سر جھکا نہیں
دربارِ کبریا سے کوئی واسطہ نہیں
عرفانِ ذات اس کو میسر نہ ہو سکا
جو آشنائے بارگہِ مصطفیٰ نہیں
شیرینیٔ انگبینِ محبت کی جانے کیا
جو شانِ مصطفیٰؐ پہ تصدق ہوا نہیں
چشمِ فلک نے دیکھے ہزاروں حسیں مگر
ان کا مثیل دہر میں پیدا ہوا نہیں
پایا ہے اس نے زندگی جاوداں کا لطف
بے شک شہیدِ عشق نبیؐ کو فنا نہیں
محروم فیض احمد مرسل شرر، ہے کون؟
بابِ کرم حضور کا کس پر کھلا نہیں

عبدالسلام شرر/بہاولپور

روحی کنجاہی ہمارے عہد کے ایک معتبر شاعر ہیں۔اس سے قبل دو مجموعے "مکتب" اور "اچھے دنوں کی آس میں" چھپ کر اپنی حیثیت منوا چکے ہیں۔پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال روحی کنجاہی کے بارے میں لکھتے ہیں "روحی کنجاہی کی شاعری ٹی ایس ایلیٹ (T.S.Eliot) کے اصول (Unifield Vencibility) پر پوری اترتی ہے۔ان کے ہاں جذبہ اور احساس بڑے توازن کے ساتھ اپنی جولانیاں دکھاتے ہیں۔ان کی فکر محسوس کرتی ہے اور جذبہ فکر میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے باوجود جذبے اور فکر کی گہرائی اور گیرائی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ان کا تازہ شعری مجموعہ "اشارا" ایک بہت بڑا استعارا ہے۔اس میں حیات و کائنات کے حوالے سے نہایت بلیغ حوالے ملتے ہیں۔(ارژنگ)

وہ جا رہی ہے شب، کبھی اختر سمیٹ لو
جتنے بھی ہاتھ آتے ہیں گوہر سمیٹ لو
شاید یہ اس دیار کا پھیرا ہو آخری
تھوڑے سے وقت میں بھی منظر سمیٹ لو!
آئندہ نسل کی بھی سہولت کے واسطے
حسبِ بساط راہ کے پتھر سمیٹ لو
بوندوں سے بجھ سکے گی کہاں خاکِ جاں کی پیاس
آنکھوں میں قطرہ قطرہ سمندر سمیٹ لو
سیدھی سی بات ہے یہ کوئی مشورہ نہیں
پھیلا رہے ہو پاؤں تک چادر سمیٹ لو
یہ بات کتنی غور طلب اور ہے فکر خیز
اُڑتے رہو خیال میں اور پر سمیٹ لو
جو موج موجِ رنگ ہے اور لہر لہر حُسن
روحیؔ نگہ میں وہ گلِ پیکر سمیٹ لو

آ رہی ہے یہ صدا آگے دیکھ
پیشِ منظر سے ذرا آگے دیکھ
لوٹ پائے گا نہ ہرگز ماضی
وقت کہتا ہے سدا آگے دیکھ
آگے ہر گام نیا منظر ہے
رستہ خود کہتا ہے آ آگے دیکھ
ہو چکا ہو وہ تو ہونا ہی تھا
کیا ابھی تک نہ ہوا، آگے دیکھ
وادیٔ زیست گھنا جنگل ہے
ابھی خطرہ ہے بڑا، آگے دیکھ
ہاتھ میں کوئی دیا ہے تو پھر
راستہ سب کو دکھا، آگے دیکھ
میں بھی آگے کی طرف دیکھتا ہوں
تو بھی اے رہنما، آگے دیکھ!
ان مناظر سے گزر جا رُوحیؔ
آنکھ اُٹھا اور ذرا آگے دیکھ

کوئی خیال آ گیا تو بے نشان رہ گئی
ہماری بات تو ہمیشہ درمیان رہ گئی
کوئی سنے تو کیا سنے، کوئی کہے تو کیا کہے
کسی کے منہ میں اک زبان بے زبان رہ گئی
یہ دیکھنا پڑے گا لفظ لفظ کو ٹٹول کر
نکل چکی ہے کتنی روح، کتنی جان رہ گئی
اِدھر اُدھر کی بات پر رواں رہے کبھی مگر
ہوئے تھے جمع جس پہ سب وہ بے گمان رہ گئی
لگا کے اپنا اپنا زور، ذرہ ذرہ چل دیا
چٹان تھی جہاں کہیں، وہیں چٹان رہ گئی
کہانیاں شہنشہوں کی ساتھ ساتھ مٹ گئیں
محبتوں کی ایک ایک داستان رہ گئی
یزید وقت بیعتوں پہ تل گیا تو آج پھر
سر وفا لٹا کے، سرکسی کی آن رہ گئی
قبولِ عام کی سند ملے نہ کس طرح اسے
غزل خیال تو کی بن کے ترجمان رہ گئی

تیرگی میں اتر رہی ہے رات
صبح تخلیق کر رہی ہے رات
کس حسیں کی ہے منتظر جانے
شام ہی سے سنور رہی ہے رات
رات آتی ہے صرف جانے کو
روز گرم سفر رہی ہے رات
کس کو حاصل ہے اختیار اس پر
کس کے زیرِ اثر رہی ہے رات
ایک مفلس کی زندگی کی طرح
جیسے تیسے گزر رہی ہے رات
جانے کون آ رہا ہے یاد اسے
سسکیاں کیسے بھر رہی ہے رات
اصل میں آخری دموں پر ہے
یوں بظاہر بکھر رہی ہے رات
آمد آمد سحر کی ہے رُوحیؔ
اپنی موت آپ مر رہی ہے رات

امجد اسلام امجد/لاہور

ستارے مل بھی سکتے تھے یہ غنچے کھل بھی سکتے تھے
اگر کچھ دیر تم رُکتے اگر موسم ملا ہوتا

اپنی مٹی رولتے ہم اور کیا
آنسوؤں سے بولتے ہم اور کیا
کوئی سنتا ہی نہیں تھا، شہر میں
بھید اپنے کھولتے، ہم اور کیا
یہ جواہر تھے بہت ہی قیمتی
کنکروں سے تولتے ہم اور کیا
تنگ ہوتے جال میں تقدیر کے
بے ارادہ ڈولتے ہم اور کیا
ایک کن رس بھی نہیں آیا نظر
رس ہوا میں گھولتے ہم اور کیا
کہ رہی تھی حال امجدؔ خامشی
تم بتاؤ، بولتے ہم اور کیا

پرندوں کی طرح اُڑتے اگر موسم ملا ہوتا
اُٹھا کر سر، یہاں چلتے اگر موسم ملا ہوتا
ہر اک منظر بدل جاتا پس منظر بدل جاتا
اگر تم مل گئے ہوتے، اگر موسم ملا ہوتا
ہمارا ساتھ جب چھوٹا خزاں کے آخری دن تھے
یہ غنچے کھل گئے ہوتے اگر موسم ملا ہوتا
تمہاری بات سننے تو رُتیں خود چل کے آتی ہیں
ہم اپنی بات بھی کہتے اگر موسم ملا ہوتا
یہی کردار بھی ہوتے، کہانی بھی یہی ہوتی
مگر قصے بدل جاتے، اگر موسم ملا ہوتا

گزرنے ہی نہیں دیتے کوئی لمحہ رفاقت کا
سے کو روک سکتے تھے اگر موسم ملا ہوتا
انہی بے سمت رستوں پر انہی سنگین راہوں پر
تمہارے ساتھ ہم چلتے اگر موسم ملا ہوتا
تمناؤں کے جو غنچے اُٹھاتے ہی نہیں سر کو
یہ بچوں کی طرح ہنستے اگر موسم ملا ہوتا
ستارے مل بھی سکتے تھے یہ غنچے کھل بھی سکتے تھے
اگر کچھ دیر تم رُکتے اگر موسم ملا ہوتا
بہت ممکن ہے بن جاتے پیمبر صبحِ فردا کے
یہ سارے پھول سے بچے اگر موسم ملا ہوتا
یہ نقشِ پا سے جو امجدؔ مٹے جاتے ہیں صحرا میں
یہ بن سکتے تھے خود رستے اگر موسم ملا ہوتا

اپنے کمالِ فن کی خبر خاک سے ملی
کوزہ گروں کو داد ہنر چاک سے ملی
اہلِ نظر کے واسطے ذلت سے کم نہیں
عزت، جو صرف زینتِ پوشاک سے ملی
ہم پر ہمارے ہونے کا کھولا ہے جس نے راز
وہ بات ایک صاحبِ ادراک سے ملی
اُس کم سخن نے اور بھی مشکل کیا اُسے
اُلجھن جو اُس کے گیسوئے پیچاک سے ملی
لوٹے گھروں کو جب وہ پرندے تو ہر خبر
اُن کو ہوا کے گریہء نمناک سے ملی

عزت ملے، ملے نہ ملے، کس کو فکر ہے
شہرت تو خوب لہجۂ بے باک سے ملی
دیکھو تو دن کے بھیس میں چھپتی ہوئی ضیاء
اہلِ نظر کو رات کے ادراک سے ملی
کیا ظلم ہے کہ شہر کے لوگوں کو روشنی
امجدؔ خود اپنے سینۂ صد چاک سے ملی

پردے ہیں لاکھ پھر بھی نمودار کون ہے!
ہے جس کے دم سے گرمئ بازار، کون ہے!
وہ سامنے ہے پھر بھی دکھائی نہ دے سکے
میرے اور اُس کے بیچ یہ دیوار، کون ہے
باغِ وفا میں ہو نہیں سکتا یہ فیصلہ
صیاد یاں پہ کون، گرفتار کون ہے!
مانا نظر کے سامنے ہے بے شمار دھند
ہے دیکھنا کہ دھند کے اُس پار کون ہے!
کچھ بھی نہیں ہے پاس پہ رہتا ہے پھر بھی خوش
سب کچھ ہے جس کے پاس وہ بےزار کون ہے
یوں تو دکھائی دیتے ہیں اسرار ہر طرف
کھلتا نہیں کہ صاحبِ اسرار کون ہے!
امجدؔ الگ سی آپ نے کھولی ہے جو دُکاں
جنسِ ہنر کا یاں پہ خریدار کون ہے!

یہ ترا شہر بھی ہے شہرِ زلیخا جاناں
وہ پیمبر ہے جو دامان کو بچا لے جائے
شوکت فہمی/نیویارک

ظہورالاسلام جاوید/ابوظہبی

ظہورالاسلام جاوید گزشتہ چالیس برس سے متحدہ عرب امارات میں مقیم ہیں۔ پاکستان سنٹر ایشین اور پاکستان سنٹر ابوظہبی کے چھ مرتبہ منتخب جنرل سیکرٹری رہے۔ ۱۹۸۲ء میں دُبئی میں پہلا عالمی مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ اُس کی نظامت کا شرف حاصل ہوا۔ سفارت خانہ پاکستان کے تمام پروگرامز کی نظامت کے فرائض بھی انجام دیے۔ سعودی عرب، بحرین، برما، قطر، برطانیہ، امریکہ، پاکستان میں عالمی مشاعروں میں شرکت کی۔ ان کا مجموعہ کلام ''موسم کا اعتبار نہیں'' شائع ہو چکا ہے۔(ارژنگ)

دلوں میں بڑھتے ہوئے فاصلے دھیان میں رکھ
پھر اس کے بعد کسی تیر کو کمان میں رکھ
برائے امن میں ہتھیار پھینک دیتا ہوں
مگر یہ شرط کہ تلوار تو بھی میان میں رکھ
سوال تیری پسند اور ناپسند کا ہے
تو یہ ضروری نہیں سب کو امتحان میں رکھ
ستم تمام تیرے میں سمیٹ لاتا ہوں
مری وفائیں بھی تو لا کے درمیان میں رکھ
پروں کو کاٹتے رہنے کے باوجود ظہور
کہا یہ جاتا ہے حوصلہ اُڑان میں رکھ

دانش و فہم کا بوجھ سنبھالے نکلے
ان کے اذہان پہ افکار پہ جالے نکلے
میں یہ سمجھا کہ کوئی نرم زمیں آ پہنچی
غور سے دیکھا تو وہ پاؤں کے چھالے نکلے
زخم کھا کر یہ تھی خوش فہمی کہ مر جائیں گے
دوستو ہم تو بڑے حوصلے والے نکلے
دل ٹٹولا شب تنہائی تو محسوس ہوا
ہم بھی اے دوست ترے چاہنے والے نکلے
آج کے دور کے سقراط پہ کیا ہوگا اثر
اپنی ہی ذات میں جو زہر کے پیالے نکلے
پھن کو پھیلائے جو یاں آج کھڑے ہیں جاوید
آستیں کے یہ مری اپنے ہی پالے نکلے

جتنی بھی تیز ہو سکے رفتار کر کے دیکھ
پھر اپنی خواہش کو گرفتار کر کے دیکھ
دیوانہ ہے جنوں بھی گزرتا ہی جائے گا
تو راستوں کو چاہے تو دیوار کر کے دیکھ
یوسف بھی ہے یہاں پہ زلیخائے وقت بھی
بس مصر کی سی گرمئی بازار کر کے دیکھ
اے محتسب روایت کہنہ کے نقش میں
تعمیر کرتا جاؤں گا مسمار کر کے دیکھ
شاید اسی میں سارے مسائل کا حل ملے
سردار ہے جو اس کو سردار کر کے دیکھ
جاوید گر ہے خواہش تسکین قلب و جاں
رُخ اپنا جانب شہ ابرار کر کے دیکھ

کبھی جبر و ستم کے روبرو سر خم نہیں ہوتا
میرا جذبہ صداقت غیر مستحکم نہیں ہوتا
سروں کی فصل کٹنے کا تو یہ موسم نہیں لیکن
سروں کی فصل کٹنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا
جنہیں آتا ہو فن اوروں کے غم اپنائے جانے کا
انہیں تا زندگی دنیا میں کوئی غم نہیں ہوتا
ہمارے دور میں اب نفسا نفسی کا یہ عالم ہے
جنازے روز اُٹھتے ہیں مگر ماتم نہیں ہوتا
زباں کے تازیانے سے کلیجے پر جو لگتا ہے
وہ ایسا زخم ہے جس کا کوئی مرہم نہیں ہوتا
ملی اسلاف سے جاوید مجھ کو صدق کی دولت
سلوک ناروا سے بھی یہ جذبہ کم نہیں ہوتا

ناصر علی سیّد کا شمار نامور شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ نامور صحافی اور اُردو ادب کے اُستاد بھی ہیں۔ پشاور میں منعقد ہونے والی ادبی محافل کی جان ہیں۔ اُن کی غزلیں اپنے منفرد موضوعات، اسلوب اور بنت کی وجہ سے قاری کو اپنے حصار میں کھینچ لیتی ہیں۔ وہ زندگی کا گہرا ادراک اور شعور رکھتے ہیں۔ زندگی کے تجربات ان کی غزل میں نہایت عمدہ مضامین لیے شعر کے روپ میں ڈھل جاتے ہیں۔ (حسن عباسی)

آنکھ میں جو روشنی تھی دل لگی تھی اور بس
کیا یہی دو چار دن کی دوستی تھی اور بس
تم نے خود اپنی محبت کا بھرم رکھا نہیں
لمس کی خواہش میں بھیگی بے کلی تھی اور بس
ہاتھ کی ساری لکیریں کہہ رہی تھیں سچ مگر
ایک چھوٹی آس تم سے بندھ گئی تھی اور بس
اس مصیبت نے تھا آنا اور یہ آ کر رہی
اپنی دشمن تیری میری آگہی تھی اور بس
پوسٹر پر جب پیار کی دیوار پر چسپاں ہوئے
شہر بھر میں اک عجب سی کھلبلی تھی اور بس
پھول ساخوں کے ہلارے سے اُدھر بھی جا گرے
جس طرف اک عمر کی سوئی کی تھی اور بس
چارسو اک گونج تھی زخمی بدن شعلے دھواں
ہر طرف لاشیں کراہیں جاں کنی تھی اور بس
درد کی آہٹ پہ آنکھیں کھول کر گھبرا گیا
سانس اُکھڑتی جا رہی تھی بے کلی تھی اور بس
موت اپنا رقص کرتی جا رہی تھی چار سو
سرخ آندھی بھی اچانک چل پڑی تھی اور بس

اک گھنے پیڑ تلے سرخ گلابوں میں ملیں
یہ ضروری تو نہیں لوگ عذابوں میں ملیں
اُس کی آنکھوں میں جھلک امن کی آئی تھی نظر
اور پھر سوچ لیا کیوں نہ سرابوں میں ملیں
لوگ چلتے ہوئے رُک جاتے ہیں رو پڑتے ہیں
گھر سے نکلے ہوئے واپس نہ خرابوں میں ملیں
بے کراں آگ میں جلتی ہے جگر پاش فغاں
بے ردا ماؤں کے ٹکڑے جو حجابوں میں ملیں
روز لاشوں کو اُٹھاتے ہوئے ہم ٹوٹ چکے
اور دشمن کہ سیاست کی نقابوں میں ملیں
شیخ کہتا ہے کہ اس جنگ میں وہ ساتھ نہیں
اُس کو تو سارے مزے اُس کے ثوابوں میں ملیں
شہر سانپوں سے بھرا ہے نہ سپیرے ہیں یہاں
گونج ایسی ہے کہ موجود یہ خوابوں میں ملیں
ہم پہ بیتی کہ ہیں الفاظ معانی سے تہی
غیر ممکن ہے کہ یہ درد کتابوں میں ملیں
تُو کچھ ایسا ہو کہ تاریخ ہمیں یاد رکھے
فیصلے آج کے آئندہ نصابوں میں ملیں

کب کہا تھا کہ مجھے وہم و گماں کھینچتا ہے
ہاں ترا ہجر مسلسل مری جاں کھینچتا ہے
تو کہ اس وادیِ حیراں میں الگ مجھ سے ہوا
نیلے پربت کو جہاں زرد دھواں کھینچتا ہے
جھیل اور چاند کے منظر میں اکیلا ہوں کھڑا
یاد ہے تو نے کہا تھا یہ سماں کھینچتا ہے
کن خرابوں میں محبت تری لے آئی ہے
دل مجھے روکتا ہے کارِ جہاں کھینچتا ہے
آج آئینہ نے مجھ سے یہ عجب بات کہی
چہرہ بجھتا ہے تو کارِ زیاں کھینچتا ہے
میں تو بس ایک ہی لمحہ کا یہاں ہو جاتا
کشتیِ جاں کو مگر وقتِ رواں کھینچتا ہے
پابجولاں میں چلا آیا تو ہوں محفل میں
دیکھو دیوانے کو اب کون کہاں کھینچتا ہے

ایک مدت سے ہوں سرگریاں ناصر
زندگی شامِ غریباں سی پریشاں ناصر
اتنا سمٹا ہے کہ میں یا ہے مرا آئینہ
کتنا پھیلا تھا کبھی حلقۂ یاراں ناصر
سب ہی بیساکھیاں نفرت کی لیے پھرتے ہیں
کتنا مفلوج ہے اس دور کا انساں ناصر
آسمانوں سے تو بس دھوپ صلیبیں اُتریں
اور زمینیں بھی ہوئیں صورتِ زنداں ناصر
خون آشام بلاؤں کی ہے زد میں دنیا
جانے کب اُتریں گی یہاں پیار کی پریاں ناصر
شعر ہونٹوں پہ لرزتا ہے ٹھٹک جاتا ہے
کیسے اس شہر میں ہو کوئی غزل خواں ناصر

مظفر حسن منصور/جوہر آباد

برسوں کی رفاقت کا صلہ کیا مجھے دیتا　　　صحرا بھی کسی بے سروساماں کی طرح تھا

پروفیسر مظفر حسن منصور کا نام شعری تخلیق کے حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ شعری سفر کا آغاز ۱۹۵۹ء میں ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اُردو کرنے کے بعد شعبہ تدریس سے وابستہ ہو گئے اور ۳۶ سالہ تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں سے ریٹائر ہوئے۔ غزل اور نظم ان کا تخلیقی میدان ہے۔ اُردو کے صفِ اوّل کے جرائد و رسائل میں تواتر سے کلام شائع ہوتا رہا اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ غزل میں ترقی پسند رویوں کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ خواہ ان کا تعلق اسلوب سے ہو یا موضوع سے۔ ان کا کہنا ہے کہ شاعر کو آمد اور سوز کا ہی پابند نہیں ہونا چاہیے۔ کبھی کبھی تجربے اور مشق کے لیے بھی شعر کہنے چاہئیں تا کہ شعر گوئی کی صلاحیت کو مہمیز لگتی رہے۔ مظفر حسن منصور ایک ترقی پسند انسان اور شاعر کی حیثیت سے حالات و واقعات سے جنم لینے والے دکھوں کا گہرا تاثر لیتے ہیں لیکن اس تاثر سے فشار، مایوسی اور اُداسی جھلکنے کی بجائے مسکراہٹ میں چھپا ہوا طنز صاف نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک وصل اور فراق ایک ہی کیفیت کے دو نام ہیں۔ ہجر کے عذاب کے پیچھے کسی بت طناز کی بے رُخی ہی کار فرما نہیں بلکہ بے رحم سماج کا ظالمانہ کردار بھی بڑا واضح ہے۔ پروفیسر مظفر حسن منصور منفرد لب و لہجے کے شاعر ہیں ان کے ذاتی مطالعے اور (Poetic Senssibility) نے انہیں روایتی اُردو شاعری کے ساتھ منسلک بھی رکھا ہے لیکن جدید جہتوں کا حامل بھی کر دیا ہے۔ (ارژنگ)

ظلمت کدۂ دل میں وہ ایماں کی طرح تھا
یزداں تو نہیں پر تو یزداں کی طرح تھا
خورشید جو اُبھرا تو مرے خوں میں نہا کر
میں بھی شفق صبح گلستاں کی طرح تھا
وہ مجھ سے بچھڑتا تو اُسے ڈھونڈ بھی لیتا
مشکل تو یہی ہے وہ رگ جاں کی طرح تھا
تو نے ہی مرے ذہن کو شاداب کیا ہے
میں سوچ کے عالم میں بیاباں کی طرح تھا
برسوں کی رفاقت کا صلہ کیا مجھے دیتا
صحرا بھی کسی بے سروساماں کی طرح تھا
پائی نہ کوئی راہ بھی ہموار جہاں میں
ہر راستہ اُس گیسوئے پیچاں کی طرح تھا
بکھرا ہوا ہر پھول گلستانِ وفا کا
منصورؔ کے افکار پریشاں کی طرح تھا

اک دورِ محبت بیت گیا اک دورِ محبت جاری ہے
اشکوں کا تلاطم ختم ہوا آہوں کی مشقت جاری ہے
یوں ہونٹوں کو سی لینے کا احساس نہ تھا پہلے ہم کو
اب راہِ محبت پر اپنی خاموش مسافت جاری ہے
کچھ یوں بھی مہذب دنیا میں انصاف کا ڈنکا بجتا ہے
مظلوم سے ہے ہمدردی بھی ظالم کی حمایت جاری ہے
دُنیائے دل میں میرے لیے انعام بھی ہے آرام بھی ہے
تکمیل حوادث کی خاطر محرومیٔ قسمت جاری ہے
"آزاد منش رہ دنیا میں پروائے اُمید و بیم نہ کر"
ہر چند نصیحت اچھی ہے پر جبر مشیت جاری ہے
منصورؔ تو اپنی فردِ عمل تحریر خود اپنے ہاتھ سے کر
کہتے ہیں قیامت آئے گی دیکھو تو قیامت جاری ہے

تو جو کچھ روز مری راہنمائی کرتا
میں بشر ہو کے زمانے پہ خدائی کرتا
صبح اک خون کی تحریر تھی لوحِ دل پر
طے نہ کوئی سفرِ شام جدائی کرتا
اُنگلیاں کاٹنے والوں کے گلے کٹ جاتے
تو جو یوسف کی جگہ جلوہ نمائی کرتا
کان عاجز ہوئے بازار کی موسیقی سے
ہونٹ سی کر بھی کوئی نغمہ سرائی کرتا
میں جو منصورؔ نہ مرتا تو مرے ساتھ سلوک
جو عدو سے نہ ہوا وہ مرا بھائی کرتا

وہ سازِ غزل کی حسیں تان تھی
مرا دل تھی وہ میرا وجدان تھی
ا ۂ تھے ہم مکتبِ عشق میں
محبت متاعِ دل و جان تھی
ہم اُس وقت سے اس قدر تھے قریب
نہ لفظوں نہ ہندسوں کی پہچان تھی
چٹکتی تھی کلیاں اُسے دیکھ کر
عجب اُس کے ہونٹوں کی مسکان تھی
وہ بچپن سے ہی میرا آدرش تھی
ازل سے مرے غم کا سامان تھی
اُسے دیکھ کر دنگ تھے اہلِ دل
وہ شیریں تھی یا حورِ سلمانؒ تھی
وہ اقبال کا طرزِ احساس تھی
کہ غالب کی سوچوں کا فیضان تھی
دُعائے سحر تھی وہ میرے لیے
حدیثِ وفا کا وہ عنوان تھی

سبک ندی کا کنارا ہے سیر کرتا جا
خنک ہوا کا اشارا ہے سیر کرتا جا
قدم قدم پہ کھلے ہیں مسرتوں کے گلاب
یہ باغ ہم نے سنوارا ہے سیر کرتا جا
جو تھوڑی دور چلے گا سکون پائے گا
لطیف وقت کا دھارا ہے سیر کرتا جا
یہ موجِ نور ہے یا صبحِ طور ہے منصورؔ
حیات ایک نظارا ہے سیر کرتا جا

باندھی گئی ہے وقت کی زنجیر پاؤں میں
گزری ہے زندگی جو فقط التجاؤں میں
دل میں بسا کے درد کی سوغات، ہم چلے
لے کر امید آئے تھے ہم تیرے گاؤں میں
دنیا میں پھر رہے گا بھلا کس پہ اعتبار
شامل کریں تجھے بھی اگر بے وفاؤں میں
کرتا ہے کون تلخیٔ حالات کا گلہ
پھر کیا جو ہم نہیں تری زلفوں کی چھاؤں میں
رندوں کا کیا قصور جو ویراں ہیں مے کدے
پہلا سا جوش بھی تو نہیں پارساؤں میں
ایسا ہے کون آسی کہ اپنا کہیں جسے
بیگانگی چھپی ہے سبھی آشناؤں میں

چپ کے سائے اور گہرے ہو گئے
رات بھر ہم کس لیے ہیں جاگتے
کوئی دستک ہے نہ کوئی چاپ ہے
دل کے دروازے ہیں کیونکر ادھ کھلے
اپنی بربادی پہ میں رویا نہ تھا
میری بربادی پہ تم کیوں رو پڑے
دل کی ویرانی کا عالم، کیا کہوں
پر خیالوں کے وہی ہیں جمگھٹے
کوئی لگتا ہے میرے نزدیک تر
کوئی دیتا ہے صدائیں دور سے
آج تو بڑھ کر مجھے تھام لو
گم ہوئے جاتے ہیں سارے راستے

اس کے ہنسنے کا سبب کچھ اور تھا
ہم تو آسی، بس یونہی رسوا ہوئے

ریت کی دیوار کو پھاندو گے تم
گر پڑے تو بیٹھ کر سوچو گے تم
تجھ سے ہٹ کر زندگی کچھ بھی نہیں
یہ ذرا سی بات نہ سمجھو گے تم
عشق میں دیوانگی کے مرحلے
طے کرو تو عقل کی مانو گے تم
چھوڑ دو مجھ کو، مگر میرے بغیر
ایک دن بے چین ہو جاؤ گے تم
دل کی بے تابی ہے اُلفت کی دلیل
یہ حقیقت بعد میں جانو گے تم
بن بلائے مان بھی تو جاؤ گے
بے سبب گر مجھ سے پھر روٹھو گے تم
میں تو شکوہ لب پہ لاتا ہی نہیں
اور کس کس کی زباں روکو گے تم
آج تو آسی پہ ہنستے ہو، مگر
اس کی خاطر ایک دن روؤ گے تم

دل کی بات ہی کر لیں
آؤ دوستی کر لیں
گھر میں کیوں اندھیرا ہے
گھر میں روشنی کر لیں
جو بھی ظلم کرنا ہے
آپ کی خوشی، کر لیں
ہم تو پیار کرتے ہیں
آپ دشمنی کر لیں
جو زمانہ کہتا ہے
آپ بھی وہی کر لیں
دیکھ کر بھی نہ دیکھیں
سن کے ان سنی کر لیں
غم کا بوجھ سہہ جائیں
اور شاعری کر لیں
اس بہانے سے آسی
گھر کی بات بھی کر لیں

شور میں کچھ سنائی دیتا نہیں
راستہ بھی دکھائی دیتا نہیں
ہر کوئی اس کے ساتھ لگتا ہے
کوئی میری صفائی دیتا نہیں
درد سے چور ہے بدن سارا
دل ہے، پھر بھی دہائی دیتا نہیں
ہے مقدر میں اتنی ویرانی
آسرا تک بھائی دیتا نہیں
دل پہ جو واقعہ گزرتا ہے
مجھ کو آسی بھلائی دیتا نہیں

شوکت علی ناز/دوحہ

مجھے تم کیا ڈراؤ گے ندی سے　　　مرے سینے میں پلتا ہے سمندر

شوکت علی نازؔ نہایت خوش فکر اور منفرد لہجے کے شاعر ہیں۔ ان کے ہاں الفاظ کے استعمال میں صاف ستھرا اور نیا پن نظر آتا ہے۔ ان کے اکثر اشعار میں طرح داری اور خوب صورتی بھی ملتی ہے۔ ان کی غزلوں میں بڑی سادگی اور روانی ہے۔ غزل میں انہوں نے عشق و محبت کے بیان کے ساتھ ساتھ زندگی سے جڑے ہوئے موضوعات کا بہت بھرپور اظہار کیا ہے۔ اس طرح ان کی شعری تخلیقات معاصر زندگی کی ترجمانی کا حق ادا کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی شاعری میں کوئی چیز مبہم نہیں ہے۔ وہ واضح طور پر اپنے نقطۂ نظر کے اظہار کے قائل ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام "چاہتوں کا خمار" کی شاعری میں متنوع موضوعات کا خوب صورت استعمال ملتا ہے۔ ان کے قلم نے باہمی رشتے، دنیا اور عالم محسوسات وغیرہ سب کو چھوا ہے اور ان کے ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے۔ شوکت علی ناز طویل عرصہ سے بسلسلہ روزگار دوحہ، قطر میں مقیم ہیں اور بڑی مہارت سے خوب صورت شاعری تخلیق کر رہے ہیں۔ وہ محبت کرنے والے شخص ہیں۔ مختلف النوع موضوعات کے ساتھ ساتھ محبت کے اچھوتے اور منفرد کئی رنگ ان کی شاعری کو انفرادیت عطا کرتے ہیں۔ (علی رضا)

گیا ایسا، نہ پھر لوٹا پرندہ
مرا ہمدم، مرے جیسا پرندہ
فلک سے پیار جس کو ہو گیا ہے
مجھے وہ جاں سے تھا پیارا پرندہ
اندھیروں میں کہیں وہ کھو نہ جائے
کسی کی آنکھ کا تارا پرندہ
بہاریں ہر طرف تھیں اُس کے دم سے
نہ جانے مجھ سے کیوں روٹھا پرندہ
فضا میں تک رہا ہے حسرتوں سے
شجر کی شاخ پر بیٹھا پرندہ
جو میرے ساتھ بھرتا تھا اُڑانیں
مجھے وہ کر گیا تنہا پرندہ
خموشی کی ردا اب اوڑھ لی ہے
سرِ گلشن چہکتا تھا پرندہ
ہوائیں پوچھتی ہیں نازؔ مجھ سے
کہاں ہے وہ ترے جیسا پرندہ

وقت کا اعتبار مت کرنا
تم مرا انتظار مت کرنا
بانٹتے رہنا چاہتوں کے گلاب
بند یہ کاروبار مت کرنا
بیٹھ کر خودکشی کی دُنیا میں
غم کے دریا کو پار مت کرنا
زندگی اک حسین نعمت ہے
اس سے حاصل فرار مت کرنا
عقل کی بات کہنے والے کو
پاگلوں میں شمار مت کرنا
نازؔ لفظوں کے تیکھے تیروں سے
تم زمانے پہ وار مت کرنا

نہ کہتا ہے نہ سنتا ہے سمندر
بس اپنی دھن میں رہتا ہے سمندر
نہ ہمسایہ کوئی اس کا، نہ سایہ
تو پھر کیوں خوف کھاتا ہے سمندر
کنارے پر نہ جانے کس سے ملنے
مرے پیروں تک آتا ہے سمندر
خزانے آنسوؤں کے مجھ سے لے کر
مجھی پر مسکراتا ہے سمندر
مجھے تم کیا ڈراؤ گے ندی سے
مرے سینے میں پلتا ہے سمندر
اُتر جاتے ہیں جو اس کی تہوں میں
گہر ان پر لٹاتا ہے سمندر
سدا موجوں سے جو ٹکرائیں شوکتؔ
انہیں پر ناز کرتا ہے سمندر

چاہتوں کا خمار ختم ہوا
جا! ترا انتظار ختم ہوا
آج سب حسرتیں تمام ہوئیں
خوا اں کا حصار ختم ہوا
ختم دنیا ہوئی خیالوں کی
خوابِ عشرت کا بار ختم ہوا
راہ میں نقشِ پا سلامت ہیں
اور سیلِ غبار ختم ہوا
اک ہنسی ہی تو تھی علاجِ غم
اُس کا بھی اعتبار ختم ہوا
ٹوٹتی جا رہی ہیں اب سانسیں
ساعتوں کا شمار ختم ہوا
ناز و انداز سارے ختم ہوئے
لطفِ لیل و نہار ختم ہوا

موج کو بے کراں تو ہونا تھا
ہر نہاں کو عیاں تو ہونا تھا
زندگی کی بساط بچھنا تھی
ظرف کا امتحاں تو ہونا تھا
گرچہ روشن بہت تھی صبحِ یقیں
پر یقیں کو گماں تو ہونا تھا
نازؔ ملنا تھی اُن کے دل میں جگہ
خانۂ دل مکاں تو ہونا تھا

عبدالرحمٰن انجم/ساہیوال

ڈھنگ جب زندگی کا آتا ہے — ہاتھ میں زندگی نہیں ہوتی

عبدالرحمٰن انجم خوبصورت لہجے کے توانا شاعر اور بہترین انسان تھے۔ چند برس قبل علالت کے باعث تقریباً ۵۸ سال کی عمر میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ انہیں اردو اور پنجابی دونوں زبانوں پر کمال دسترس حاصل تھی۔ ان زبانوں میں انہوں نے خوبصورت تخلیقی پھول کھلائے۔ ان کی اردو شاعری کا نعتیہ مجموعہ "شہر شرف" کے نام سے ان کی زندگی کے آخری ایام میں شائع ہوا تو اُسے شعری حلقوں کی طرف سے بھرپور پذیرائی ملی۔ غزل و نظم کے تخلیقی عمل سے بھی اُن کے فنی مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ایک درویش صفت انسان تھے۔ تمام عمر لوگوں میں محبتیں بانٹتے رہے۔ علامہ اقبال صلاح الدین، حاجی بشیر احمد بشیر، گوہر ہوشیار پوری اور دیگر اساتذہ سخن کی صحبت ادبی اور تہذیبی تربیت نے ان کی شخصیت میں بہت سے دل فریب رنگ بھر دیے تھے۔ (ارژنگ)

"لوگ کیا کیا جہان چھوڑ گئے"

اُسے پاؤں تلے روندا گیا
جدا تو شاخ سے پتا ہوا ہے
ہوئی خائف مرے جذبوں کی دنیا
چمن میں کوئی تو اُتری بلا ہے
یہی ہے تیری چاہت کی گواہی
مری آنکھوں میں زندہ رتجگا ہے
ابھی وہ سامنے بیٹھیں ہیں پھر بھی
مرے دل میں یہ کیسا وسوسہ ہے
سپردِ آرزو کرتے ہیں جیون
اگر اُلجھا ہوا ہر مسئلہ ہے
ہوا کیوں شہر پر لرزا سا طاری
کوئی طوفاں نہ کوئی زلزلہ ہے
نظر میں سینکڑوں منظر ہیں لیکن
مری آنکھوں میں تو ٹھہرا ہوا ہے
بتا کر زندگی یاروں میں اپنی
ہنر چہرہ شناسی کا ملا ہے
ہر اک خواہش بکھر جاتی ہے ایسے
کہ جیسے شاخ سے پتا گرا ہے
یہ کیسے غم اُتر آئے ہیں دل میں
ہمیں یکجان ہو کر سوچنا ہے
نجانے کون سلجھائے گا اس کو
وہی میرا جو تیرا مسئلہ ہے

جدا ہوتا ہے جب ٹہنی سے پتا
شجر اس سانحے پر چیختا ہے
اگر تو ڈھونڈتا انجم تو ملتا
ہمارے گھر کا آساں راستہ ہے

تری یادوں کا پل پل جاگتا ہے
مرے گھر میں وہی تازہ ہوا ہے
مسافر کرب کے صحرا کا مجھ سے
لپٹ کر اشک سارے پی گیا ہے
پتا چلتا ہے مشکل وقت ہی میں
کسی کا کس سے کتنا واسطہ ہے
تمہارے ہجر میں کھل کر جو رویا
غموں کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا ہے
وہ دیکھو! کتنا پرامید پنچھی
تلاشِ رزق میں پر تولتا ہے
نشیبو کے کینو ہوش کرنا
رواں پھر پانیوں کا قافلہ ہے
ہمارے واسطے تو ہر قدم پر
مسائل کی نئی اک کربلا ہے
کسے راس آئی یہ دنیا ہے پیارے
ہمارا بھی یہاں کچھ تجربہ ہے
ہمیشہ چاندنی راتوں میں انجم
ان آنکھوں میں سمندر جاگتا ہے

نگاہوں میں ٹھکانے اور بھی ہیں
مرے محسن گھرانے اور بھی ہیں
میں تیرے ساتھ جینا چاہتا ہوں
اگر ایسے زمانے اور بھی ہیں
ابھی تم چھوڑ کر جاؤ نہ مجھ کو
ابھی کچھ غم اُٹھانے اور بھی ہیں
ابھی سے ہو گئے ہو آبدیدہ
مرے غم کے فسانے اور بھی ہیں
سنا ہے اُس ستمگر کی نظر میں
مرے جیسے نشانے اور بھی ہیں
میں تنہا جتلائے غم نہیں ہوں
یہاں مفلس گھرانے اور بھی ہیں
اُٹھا دو گے اگر ان کو گلی سے
فقیروں کے ٹھکانے اور بھی ہیں
سنو! انجم مرے دل کے کھنڈر میں
محبت کے خزانے اور بھی ہیں

درد کو درماں کے تیور دے گیا
حوصلے کیا کیا ستمگر دے گیا
اب کے موسم میں عجب تاثیر تھی
پنچھیوں کو قید میں پر دے گیا
منتظر رہتے تھے انجم جس کے ہم
کیا سے الزام سر پر دے گیا

زاہد عباس سیّد/لاہور

دل میں کچھ ایسے تصور ہے کسی کا زاہد　　جیسے صحرا میں کوئی پیڑ اُگا رکھا ہے

۸۶-۸۵-۱۹۸۴ کے دوران "فنون"، "اوراق" اور "سیپ"، "افکار"، "محفل" اور "ماہ نو" جیسے ادبی جرائد میں نگارشات شامل اشاعت رہیں۔ ۱۹۹۰ء کے دوران مکتبہ فکر و خیال کے زیر اہتمام ادبی انٹرویوز پر مشتمل کتاب "مکالمات" کے (کو آتھرز) مصنفین میں شامل ہونے کا بھی اعزاز رہا۔ یہ کتاب ایم اے اُردو کے لیے بھی مفید قرار دی گئی..... ایم اُردو (پنجابی یونیورسٹی) عملی صحافت کا سلسلہ نوعمری میں شروع ہوا جو ۳ عشروں سے جاری ہے۔ روزنامہ امروز، آزاد، مساوات، پاکستان، دن، نیوز ایڈیٹر کے طور پر فرائض انجام دیے۔ حال..... (سینئر صحافی روزنامہ ایکسپریس فرائض انجام دے رہے ہیں)

پیار میں ٹوٹا ہوا دل ہے چلو یونہی سہی
گر یہی عشق کا حاصل ہے چلو یونہی سہی
دوستو میں تو یہ کہتا ہوں بھنور ہے آگے
تم جو کہتے ہو کہ ساحل ہے چلو یونہی سہی
اپنے قاتل کو مسیحا بھی یہاں کہتے ہیں
یہ وضع داریٔ بسمل ہے چلو یونہی سہی
اک ذرا ضبط کہ آنسو نہ ٹپک جائیں کہیں
وہ اگر جور پہ مائل ہے چلو یونہی سہی
میں جو زندہ ہوں تو عباس وفا کی خاطر
تجھ کو اقرار بھی مشکل ہے چلو یونہی سہی

ہر اک قدم چراغ تری رہگزر کا تھا
یہ اور بات ہے کہ نہ یارا سفر کا تھا
برباد جس کو تو نے پرکھنے میں کر دیا
لمحہ وہ آزمائش حُسن نظر کا تھا
تم جس کو پار کر کے بھی ساحل سے دور ہو
دریائے بیکراں وہ مری چشم تر کا تھا
کرنوں کا منتظر تھا اسے کچھ خبر نہ تھی
پنہاں شب طویل میں چہرہ سحر کا تھا
تیری نوازشوں میں تو کوئی کمی نہ تھی
گر کچھ قصور تھا تو شب مختصر کا تھا
جانے وہ کوئی موڑ کہاں پر سے مڑ گیا
زاہد وگرنہ راستہ میرے ہی گھر کا تھا

حسن کی بے رخی کی بات کرو
عشق کی بے بسی کی بات کرو
پھر کوئی چہرہ یاد آتا ہے
جب بھی کھلتی کلی کی بات کرو
اس کی زلفوں کی بات رہنے دو
اپنی آوارگی کی بات کرو
راستے جگمگا اٹھیں گے پھر
اس کی روشن گلی کی بات کرو

گلستاں تیرا سہی خونِ جگر میرا ہے
پھول سے چہرے پہ یہ رنگ مگر میرا ہے
میں کسی صبح کے تارے پہ نظر کیوں رکھوں
منزلیں میری ڈگر میری سفر میرا ہے
اپنی قامت کی خبر تجھ کو کہاں تھی پہلے
اے فلک گیر یہ فیضانِ نظر میرا ہے
اپنی دلہیز کے منصب کا تجھے پاس نہیں
میں بجا طور پہ نازاں ہوں کہ سر میرا ہے
میری پہچان زمانے میں ہے اتنی زاہد
وہ ہے مفہوم کوئی نام اگر میرا ہے

شب ہجراں میں اُجالا سا بنا رکھا ہے
دل میں روشن تری یادوں کا دیا رکھا ہے
اس کی تعبیر نہیں دیتا نہ دے وہ لیکن
ہم نے اک خواب تو آنکھوں میں سجا رکھا ہے
کس نے پھر عہد یزیدی سے بغاوت کی ہے
کس کا سر وقت نے نیزے پہ اُٹھا رکھا ہے
دل میں کچھ ایسے تصور ہے کسی کا زاہد
جیسے صحرا میں کوئی پیڑ اُگا رکھا ہے

ہے مقدر میں مرے گردشِ ایام ابھی
ہر سحر کے ہے تعاقب میں وہی شام ابھی
ذہن انسان سے نکلے نہیں اوہام ابھی
"عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی"
اک زمانے نے گواہی مری دی ہے لیکن
اس کی نظروں میں ہوں میں موردِ الزام ابھی
وہ عدالت کا کٹہرا ہو کہ مقتل کی زمیں
دیکھنا ہے تجھے ہر ظلم کا انجام ابھی
میں نے مانا تری قربت ہے بڑی چیز مگر
دہر میں اور ضروری ہیں مجھے کام ابھی
عشق کی راہ میں رُسوائی کا ڈر ہے کیسا
اور بھی ہونا ہے زاہد مجھے بدنام ابھی

امین اُڈرائی/ٹمیاری (سندھ)

چھوڑ جاتے ہیں جو احباب مرے آنگن میں
تلخ لفظوں کی چبھن اوڑھ کے سو جاتا ہوں

پتھر کا شہر لوگ ستم گار کی طرح
ہم آ گئے ہیں آئینہ بردار کی طرح
ہوتا ہے ذکر اس کا زمانے میں اور بلند
جھکتا ہے جو بھی شاخِ ثمردار کی طرح
پرسانِ حال کوئی میسر نہ آ سکا
ہر غم چھپا لیا سو، غمِ یار کی طرح
ہر اک خوشی ہے درد کے ہاتھوں میں یرغمال
عہدِ فغاں میں شوخیٔ رُخسار کی طرح
تاراج کر گئیں ہیں مرے دل کے شہر کو
نظریں تھیں اس کی یورشِ تاتار کی طرح
اک عمر فکر بانٹتے گزری ہے دوستو
گھر گھر میں جا کے روز کے اخبار کی طرح
کشتِ وفا کو کاٹ لیا قرض میں امینؔ
اُس کا حساب بھی ہے زمیندار کی طرح

اس کو روکا نہ اشکباری کی
دل نے حد کر دی بردباری کی
مجھ میں چھپ کر وہ روئی دیر تلک
بات پوچھو نہ بے قراری کی
اتنی شدت تھی میرے زخموں میں
کہ تسلی نے ضربِ کاری کی
اوڑھ کر درد کی گھٹا ہم نے
لاج رکھی وفاشعاری کی
عمر بھر پتھروں کی زد میں رہا
آئینے کی جو پاسداری کی
کوئی سورج اُٹھا کے لے آیا
بات نکلی تھی برف باری کی
ایک لمحے کی بھول کر کے امینؔ
ہم نے برباد عمر ساری کی

وحشتیں، خوف، گھٹن اوڑھ کے سو جاتا ہوں
روز اک خستہ بدن، اوڑھ کے سو جاتا ہوں
جب بھی یادوں کے دریچوں سے دھواں اُٹھتا ہے
اپنی آہوں کی جلن اوڑھ کے سو جاتا ہوں
چھوڑ جاتے ہیں جو احباب میرے آنگن میں
تلخ لفظوں کی چبھن اوڑھ کے سو جاتا ہوں
رات ہوتے ہی میں دھرتی کو بنا کے بستر
اپنے تن پر یہ گگن اوڑھ کے سو جاتا ہوں
تیرے احساس کی خوشبو کو بسا کر دل میں
تیرے لہجے کی تھکن اوڑھ کے سو جاتا ہوں
شب کی دہلیز پہ سر رکھ کے میں چپ چاپ امینؔ
خواہشِ صبحِ چمن اوڑھ کے سو جاتا ہوں

زخم سارے بھلا کے جیتے ہیں
دیکھ ہم مسکرا کے جیتے ہیں
تم سے خوشیاں نہیں سنبھلتی اور
ہم تو صدمے اُٹھا کے جیتے ہیں
زیست کرنے کا ان سے سیکھو ہنر
جو کہ سب کچھ لٹا کے جیتے ہیں
کل بھی اُونچی تھیں گردنیں اپنی
آج بھی سر اُٹھا کے جیتے ہیں
دشت وحشت میں دیکھ لو آ کر
اپنی سانسیں چھپا کے جیتے ہیں
خانۂ دل میں مدتوں سے امینؔ
جشن گریہ منا کے جیتے ہیں

فصلِ غم بہار کا سوا نہیں کیا
اس چشمِ اشکبار کا سودا نہیں کیا
مجنوں بنے تو چاک گریباں کیا قبول
دامانِ تار تار کا سودا نہیں کیا
لوگوں نے رکھ دیے ہیں دکانوں پہ لا کے پھول
ہم نے تو ایک خار کا سودا نہیں کیا
رنگینوں کے شہر میں آ کر بھی دوستو
خوابوں کے ریگذار کا سودا نہیں کیا
قدموں میں کیا سے کیا نہیں رکھا گیا مگر
ہم نے تمہارے پیار کا سودا نہیں کیا
دشمن بنا لیا ہے جہاں کو مگر امینؔ
یاروں کے اعتبار کا سودا نہیں کیا

اعظم توقیر/ حافظ آباد

جدید لہجے کے نوجوان شاعر ادیب، محقق، افسانہ نگار، صحافی اور ریڈیو اینکر اعظم توقیر کا تعلق ادبی حوالے سے انتہائی زرخیز خطہ حافظ آباد سے ہے۔ حافظ آباد نے اردو اور پنجابی ادب کو سردار دیوان سنگھ مفتوں، راجندر کرشن، شیخ رؤف، حیرت جلال پوری، علامہ ذکی سرور کوئی، جیون پرکاش جیون جیسے شعراء ادباء اور صحافی پیدا کیے۔ حافظ آباد کے موجودہ شعراء میں اعظم توقیر ایک اہم نام ہے جو بیک وقت شاعر، ادیب، محقق اور صحافی ہیں۔ ان کی اب تک تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں "خواب ٹوٹ جاتے ہیں" ۲۰۰۵ء، حافظ آباد کا ادبی ورثہ ۲۰۱۰ء، چھوٹی سی غلط فہمی ۲۰۱۲ء شامل ہیں۔ اگلی کتاب "چناب کنڈھے دا ادب" پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ اینڈ لینگویج کے زیر اہتمام جلد شائع ہو رہی ہے۔

پتھر چہرے آنکھیں پتھر
سارے شہر کی سوچیں پتھر
اُس کا لہجہ پھولوں جیسا
لیکن اُس کی باتیں پتھر
بارش کی کیا خواہش کی تھی
اب تک ہم پہ برسیں پتھر
کیا کاٹیں گی اگلی نسلیں
آج اگر ہم بوئیں پتھر
دل تو کب کے ٹوٹ چکے ہیں
اب سینوں میں دھڑکیں پتھر
دل بستی کے بے بس باسی
جانے کب تک پوجیں پتھر
یاروں کے اس شیش محل میں
کیوں توقیر اچھالیں پتھر

کیا خاک گھنی چھاؤں میں رکھا گیا مجھ کو
جلتے ہوئے صحراؤں میں رکھا گیا مجھ کو
مت پوچھ مرے عہد گزشتہ کی کہانی
گھنگرو کی طرح پاؤں میں رکھا گیا مجھ کو
میں بام ثریا سے تھا ٹوٹا ہوا تارا
دم توڑتی آشاؤں میں رکھا گیا مجھ کو
یہ بات الگ گھاؤ مرے اور بڑھے ہیں
کہنے کو مسیحاؤں میں رکھا گیا مجھ کو
ہاں وہ بھی کسی اور پجاری کا خدا تھا
جس بت کی تمناؤں میں رکھا گیا مجھ کو
وہ ہاتھ امانت تھا کسی اور کی شاید
جس ہاتھ کی ریکھاؤں میں رکھا گیا مجھ کو
جس گاؤں میں وحشت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا
توقیر اسی گاؤں میں رکھا گیا مجھ کو

کہیں پہ نیزہ کہیں پہ بھالے پڑے ہوئے ہیں
جدھر بھی دیکھو مرے حوالے پڑے ہوئے ہیں
فلک پہ بھی انتشار پھیلا ہوا ہو جیسے
کہ چاند تاروں کے رنگ کالے پڑے ہوئے ہیں
کوئی مری زندگی کی آ کر کمائی دیکھے
قلم، کتابیں ہیں کچھ رسالے پڑے ہوئے ہیں
یہ بھوک سے مر گیا ہے یا سو گیا ہے دیکھو
کہ اس کے حصے کے سب نوالے پڑے ہوئے ہیں
زمانہ توقیر کتنا آگے نکل گیا ہے
اور ایک ہم ہیں پڑاؤ ڈالے پڑے ہوئے ہیں

سچ کہوں گا تو سزا دیں گے ترے شہر کے لوگ
مجھ کو سولی پہ چڑھا دیں گے ترے شہر کے لوگ
باتوں باتوں میں ترا ذکر کریں گے مجھ سے
یوں بھی زخموں کو ہوا دیں گے ترے شہر کے لوگ
ایک دیوار گرا دوں بھی تو اے جانِ غزل
نئی دیوار اٹھا دیں گے ترے شہر کے لوگ
میں نے صدیوں میں تھا ہنسنے کا سلیقہ سیکھا
کیا خبر تھا کہ رُلا دیں گے ترے شہر کے لوگ
اک لہو رنگ کے دریا سے گزاریں گے مجھے
یوں مری پیاس بجھا دیں گے ترے شہر کے لوگ
میں تو شمع ہوں مری عمر ہی کیا ہے ساقی
شب گزرتے ہی بجھا دیں گے ترے شہر کے لوگ
مجھ کو توقیر سے آوارہ بنا ڈالا ہے
اس سے بڑھ کر مجھے کیا دیں گے ترے شہر کے لوگ

گھونٹا ہے خواہشوں کا گلا اتنے زور سے
رسنے لگا ہے خون، مری پور پور سے
نازک مزاج اتنا ہے وہ کچھ نہ پوچھئے
نیند اس کی ٹوٹ جاتی ہے دھڑکن کے شور سے
آداب جنگ اپنی جگہ ٹھیک ہی سہی
جو شخص گھر گیا ہو مگر چاروں اور سے
بکھرا ہوں ایسے ٹوٹ کے اب تک نہیں جڑا
پھینکا تھا آسماں نے مجھے اتنے زور سے
توقیر اُن سے ملنے کا موسم قریب ہے
جو من کے جنگلات میں ناچے ہیں مور سے

فرتاش سید اس لحاظ سے بے حد خوش قسمت ہے کہ اس کی تربیت ایک بے لاگ استاد مصیب الرحمٰن نے کی۔ جی ہاں وہی مصیب الرحمٰن جو مجلس فروغ اُردو ادب دوحہ قطر کے روح رواں تھے۔ صرف شعر کا ذوق ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ فن شاعری سے بھی بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے فرتاش سید کی تربیت روایتی اساتذہ کی طرح کی۔

اب اگر دو لفظوں میں فرتاش سید کی شاعری کو بیان کرنا ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ پرانی زمین میں نیا بیج اُگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری خوبی جو ان کے کلام میں پیدا ہوئی ہے وہ غنائی تنوع (Musical Variation) ہے۔ ابھی سے ان کے ہاں آواز لگانے کا ایک خصوصی پیرایہ پیدا ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر یہ کتاب اُن کی پہلی کوشش ہے۔ صرف "حاشیہ" ہے جس میں ابھی رنگ بھی بھرے جانے ہیں اور رنگ متون کا اُبھر آنا بھی متوقع ہے۔ بحریں بھی کئی طرح کی استعمال کی گئی ہیں جن کی توقع کسی بھی نوجوان کے پہلے مجموعے سے نہیں کی جاتی۔

گلی کا پتھر تھا، مجھ میں آیا بگاڑ ایسا
میں ٹھوکریں کھا کے ہو گیا ہوں پہاڑ ایسا

خدا خبر، دل میں کوئی آسیب ہے کہ اس میں
کوئی نہ آیا گیا، پڑا ہے اُجاڑ ایسا

حصار اٹھا پائے کوئی بھونچال مجھ میں، اے وقت!
میں نرم مٹی ہوں سو مجھے تو نہ تاڑ ایسا

چہار جانب پڑے ہیں پرزے نگاہ و دل کے
ہمارا اس عشق نے کیا ہے کباڑ ایسا

میں بھول بیٹھا ہوں ہنسنا فرتاشؔ بھول بیٹھا
ہوا ہے خوشیوں کا بند مجھ پر کواڑ ایسا

اپنی اپنی زبان بولتے ہیں
یہ زمیں آسمان بولتے ہیں

گفتگو ہو تو شہر جاں میں سکوت
خامشی ہو تو کان بولتے ہیں

کچھ کہیں تو فصیلیں سنتی ہیں
چپ رہیں تو مکان بولتے ہیں

بات ہوتی ہے دو دلوں کے بیچ
اور دو خاندان بولتے ہیں

دکھ تو یہ ہے کہ آپ ایسے دوست
دشمنوں کی زبان بولتے ہیں

جو سر بزم بولے ہم، تو کہا
آپ کیوں درمیان بولتے ہیں

اک نہیں اذنِ گفتگو ہم کو
آپ کے ترجمان بولتے ہیں

آدمی بولتا ہے نیزے پہ
جب بھی تیر و کمان بولتے ہیں

عشق ہوں، جرأت اظہار بھی کر سکتا ہوں
خود کو رُسوا، سر بازار بھی کر سکتا ہوں

تو سمجھتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں تیرے بغیر
میں ترے پیار سے انکار بھی کر سکتا ہوں

غیر ممکن ہی سہی تجھ کو بھلانا، لیکن
یہ جو دریا ہے اسے پار بھی کر سکتا ہوں

تو مری امن پسندی کو غلط نام نہ دے
وار سہتا ہی نہیں، وار بھی کر سکتا ہوں

میکدہ، کارِ دگر اور جناب واعظ
ایسی نیکی میں میں رِ بھی کر سکتا ہوں

داورا! میں تری دنیا میں تو خاموش رہا
پر سرِ حشر میں تکرار بھی کر سکتا ہوں

خوف زنداں ہے نہ اندیشۂ تعزیر مجھے
میں تو حق بات سرِ دار بھی کر سکتا ہوں

دل تری یاد کے مکان میں ہے
مطمئن شہر بے امان میں ہے

آسماں ورنہ سب کو کھا جاتا
کوئی تو ہے جو آسمان میں ہے

دل کی کیا بات مان لی میں نے
ایک ہنگامہ خاندان میں ہے

جانے والے بھی لوٹتے ہیں کبھی
دل خوش فہم! کس گمان میں ہے

مست ہوں تجھ سے گفتگو کر کے
اک نشہ سا تری زبان میں ہے

بن سنور کر وہ آ گئے فرتاشؔ
آدمی، سخت امتحان میں ہے

ایک دریا ہوں روانی کے لیے آیا ہوں
یعنی آشفتہ بیانی کے لیے آیا ہوں

تیری محفل سے مجھے کچھ نہیں لینا دینا
میں تو بس یاد دہانی کے لیے آیا ہوں

اپنے ہونٹوں سے ادا کر کہ میں زندہ ہو جاؤں
لفظ ہوں اور معانی کے لیے آیا ہوں

صوفیہ بیدار/لاہور

محبت میں کہاں کچھ سوجھتا ہے
بچا لوں دل تو پھر گھر ٹوٹتا ہے

"خاموشیاں" نغمہ و آہنگ کی جھیل میں پھینکا ہوا پہلا پتھر ہے لیکن اس کے ارتعاش سے جو لہریں اُبھری ہیں وہ بے حد مضبوط ہیں۔ صوفیہ کی شاعری جمالیاتی ہونے کے علاوہ ایک واضح مقصد بھی رکھتی ہے اور آج کل کی شاعرات کے ہاں یہ خصوصیات ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتیں۔ صوفیہ بیدار کی خاموشیاں عورت کے بارے میں عمومی اور روایتی طور پر روا رکھے جانے والے رویے کے خلاف صدائے احتجاج ہے لیکن ملاحت اور محبت کے ساتھ۔ وہ یہ تسلیم کرانا چاہتی ہے کہ عورت کے پاس ظاہری حسن کے علاوہ چارہ مغز بھی ہے۔ وہ دل سے محسوس کرتی ہے تو دماغ سے سوچ بھی سکتی ہے۔ (خالد شریف)

وہ تجدید وفا کی کیا گھڑی تھی
مری توبہ مرے آگے کھڑی تھی
قدم اُٹھتے نہیں تھے تیرے گھر کو
عجب مشکل سی مجھ پر آ پڑی تھی
انگوٹھی میں خلا دُکھ درد کا تھا
نگینہ بن کے اس میں مَیں جڑی تھی
بس اک جیون میں سلجھاتی مَیں کیسے
یہ اُلجھن عمر میں مجھ سے بڑی تھی
مرا جو قافلہ تھا کیا ہوا وہ
جو دیکھا مڑ کے اک مَیں ہی کھڑی تھی

ہوں گے گنہ معاف مگر احتیاط سے
رستے بھی ہوں گے صاف مگر احتیاط سے
اُس کے مزاج میں ہے بہت رکھ رکھاؤ وہ
کرتا ہے اختلاف مگر احتیاط سے
کرلوں گی ساری بات ابھی ہو کے رُوبرو
میں اس سے صاف صاف مگر احتیاط سے
دل کا یہ آئنہ بھی بڑا زود رنج ہے
کرتی ہوں اس کو صاف مگر احتیاط سے
اب بھی ہجومِ درد کا مرکز وہی تو ہے
کرتا ہے دل طواف مگر احتیاط سے
بے احتیاطیوں نے نہ چھوڑا کہیں کا بھی
ہے مجھ کو اعتراف مگر احتیاط سے
دنیا کے ساتھ دل کی بھی مانی ہے صوفیہ
کرتی ہوں انحراف مگر احتیاط سے

کسی کے دھیان میں بیٹھی ہوئی ہوں
خود اپنا آپ بھی بھولی ہوئی ہوں
مجھے ہنسنے کا حق حاصل ہے اُس پر
میں اُس کے پیار میں روئی ہوئی ہوں
تعاقب کرتی ہیں میرا دو آنکھیں
کئی دن سے بہت سہمی ہوئی ہوں
جہاں بچپن کے دن گزرے تھے میرے
وہ گلیاں دیکھنے آئی ہوئی ہوں
کسی بھی وقت بن سکتی ہوں آنسو
میں اُس کی آنکھ میں ٹھہری ہوئی ہوں
پہیلی مجھ سے بجھوائے نہ کوئی
میں پہلے بھی بہت اُلجھی ہوئی ہوں
ضرورت کی بہت چیزیں ہیں گھر میں
میں اُن کے ساتھ ہی رکھی ہوئی ہوں
مجھے کیوں صوفیہ لگتا ہے ایسے
یہاں سے پہلے بھی گزری ہوئی ہوں

جھوٹے لفظوں کی آن بان میں تھی
تیرے بخشے ہوئے جہان میں تھی
گھر کو چھوڑوں کہ چھوڑ دوں تم کو
میں مسلسل ہی امتحان میں تھی
لفظ ارزاں تھے بات گہری تھی
چپ کی دیوی تو اپنی شان میں تھی
اک پری ہوں میں اُس کے دربن کی
ایک مدت سے اس گمان میں تھی

رنج پالا ہے نہ کینہ دل نے
ڈر کے سیکھا نہیں جینا دل نے
اب اذیت نہیں سہنی کوئی
زہر اَب کے نہیں پینا دل نے
تیری فرقت میں ہرا رکھنا ہے
زخم اب کے نہیں سینا دل نے
بارہا ٹوٹ کے جڑ جاتا ہے
ایسا سیکھا ہے قرینہ دل نے
اپنے اندر ہی بسا رکھا ہے
شہر لولاکؐ مدینہ دل نے

تن دیپ تمنا / کینیڈا

(نثری نظمیں)

تن دیپ کی زندگی اُس کی نظموں میں بکھری ہوئی ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ اُس کی شاعری اُس کی آپ بیتی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ اپنی زندگی کے اردگرد بکھرے موضوعات سے اپنی نظمیں کشید کرتی ہے اور انہیں نذرِ قارئین کر دیتی ہے۔ تن دیپ کی نظموں میں سچ کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے اور یہ خوشبو قاری کو بھی مسحور کرتی ہے۔ تن دیپ کی نظموں کی دوسری بڑی خوبی اُس کی امیجری ہے۔ وہ غضب کی امیجسٹ ہے۔ نظم کی لائنوں میں ایسے منفرد، دل پذیر اور پُرکشش امیج بناتی ہے کہ قاری خود بھی اس منظر کا حصہ بن کر رہ جاتا ہے۔ تن دیپ کی نظم موسم کی طرح ہے جس کے آپ عادی تو ہو سکتے ہیں مگر اُس کی فضا سے اچانک باہر آنا ناممکن ہے۔ (حسن عباسی)

گھر کا زینہ

سرد رُت کی
پہلی برفانی ہوا چلی ہے
میں آہستہ آہستہ
زینے سے اُتر رہی ہوں
اور سوچ رہی ہوں
نہ جانے کتنی صدیوں سے یہ زینہ
دیواروں کی خاموشی، میری تنہائی
اور موسم کی تبدیلی سے بے خبر
یوں ہی سو رہا ہے
اتنی گہری نیند ہے
کہ گونجتی ہواؤں کے شور سے
میرے قدموں کی آہٹ سے
اس کی آنکھوں کے پُرسکون پانی میں
کوئی ہلچل نہیں ہوتی
بجلی کی چمک سے
اس کے ہاتھوں سے
خوابوں کے پرندے
بے چین ہو کر نہیں اُڑتے
سوکھے پتوں کی سرسراہٹ سے
اس کے تصور کے پازیب نہیں بجتی
پھر سوچتی ہوں کہ شاید
اس گھر میں فقط
یہ لکڑی کا زینہ ہی تو سلامت ہے
جس کی خیالوں کو
نیندوں کو، خوابوں کو
اتنے برسوں میں
دیمک نے نہیں چاٹا......
اس لیے تو
اتنی بے خبری سے سو رہا ہے یہ زینہ
اور میں جاگ رہی ہوں......

ماں اکثر کہتی ہے

ماں اکثر کہتی ہے
آدھی رات تک
پڑھتی لکھتی رہتی ہوں
آنکھیں پتھر ہو جاتی ہیں
پھر کیسے ہو نیند نہیں آتی
او میری بھولی ماں
کاش! کبھی تم نے
میری آنکھوں میں پتھر ہوئے
سپنے دیکھے ہوتے
میرے راتوں کو جاگنے کا
سبب جان جاتی
کبھی چاندنی رات میں دیکھنا
میری آنکھوں میں سپنے نہیں
پتھر تیرتے ہیں
گونگے، بہرے ڈھیروں پتھر......
میز پر کانچ کے گلدان میں
جتنے چھوٹے چھوٹے اُداس پتھر ہیں
سب میرے سپنے ہیں......

میرے گھر کے پتے پر......

میرے گھر کے پتے پر
اب خط نہیں آتے
آتے ہیں تو بس
میپل کے سوکھے Maple
دربدر بھٹکتے پتے......
بے خبر لوگوں کے
پاؤں تلے روندے
چیری کے پھول Cherry
بہاروں سے بغاوت کرتے
میرے خیالوں جیسے
برف کے خاموش پرے
مفت کی اخباروں میں چھپے
رنگ برنگے
سینکڑوں اشتہار......
صحن میں بجتیں ونڈ چائمز Wind Chmes
کوئی مجبل پر سجیں موم بتیاں
بجھ پڑتی ہیں
اب میں نے ہر دستک پہ
دروازہ کھولنا چھوڑ دیا ہے

توقیر تقی / کراچی

خشک پیڑوں کو کتنا پڑتا ہے — اپنے ہی اشک پی ہرا ہو جا

درد جب دل سے نشیں ہے، عشق ہے
اس مکاں میں کچھ نہیں ہے، عشق ہے
دیکھ دشتِ یار کا اعجاز دیکھ!
میں کہیں ہوں، تو کہیں ہے، عشق ہے
تھک کے بیٹھا ہوں جو کنجِ ذات میں
مہرباں کوئی نہیں ہے، عشق ہے
جو ازل سے ابھرتی ہیں، اشک ہیں
جو اِن اشکوں میں مکیں ہے، عشق ہے
اے سرابِ جبر و استبداد سن!
یہ جو پیاسوں کا یقیں ہے عشق ہے
کل جہاں دیوار ہی دیوار تھی
اب وہاں در ہے، جبیں ہے، عشق ہے
خواب ہی میں دیکھ لے تعبیرِ خواب
کون ایسا پیش بیں ہے، عشق ہے
جیتے جی دُشوار کتنا تھا سفر
اب نہ دنیا ہے، نہ دیں ہے، عشق ہے
رنج و غم کی سرمئی چادر تقی
جب سے بالائے زمیں ہے، عشق ہے

کب عشق کے ماروں کو سکوں ہوتا ہے صاحب
جب درد نہیں ہوتا، جنوں ہوتا ہے صاحب
صبحوں ہی پہ موقوف نہیں روشنیٔ جاں
شاموں میں بھی آنکھوں کا فسوں ہوتا ہے صاحب
بے کاسہ فقیروں سے نہیں پوچھتا کوئی
کس طرح تمناؤں کا خوں ہوتا ہے صاحب
یہ عشق جو اپنا ہمیں ہونے نہیں دیتا
یہ عشق بھی، ہوتا ہے تو کیوں ہوتا ہے صاحب
فطرت کا سبق اہلِ یقیں بھولتے کب ہیں
جب عشق کہے کُن، فیکوں ہوتا ہے صاحب
وہ تو کوئی چوکھٹ ہی کشش رکھتی ہے ورنہ
ہر در پہ کہاں سر یہ نگوں ہوتا ہے صاحب
ہر شام چراغوں کی طرح جلتی ہیں آنکھیں
کیا کوئی چلا جائے تو یوں ہوتا ہے صاحب

لفظ کی قید سے رہا ہو جا
آ! مری آنکھ سے ادا ہو جا
پھینک دے خشک پھول یادوں کے
ضد نہ کر، تو بھی بے وفا ہو جا!
خشک پیڑوں کو کتنا پڑتا ہے
اپنے ہی اشک پی، ہرا ہو جا
چھیڑ اس حبس میں مہکتی غزل
اور در کھولتی ہوا ہو جا
سنگ برسا رہے ہیں شہر کے لوگ
تو بھی یوں ہاتھ اُٹھا، دُعا ہو جا
خود کو پہچان، اِدھر اُدھر نہ بھٹک
اپنے مرکز پہ دائرہ ہو جا
اور پھر ہو گیا میں آئنہ رُو
اُس نے اِک بار ہی کہا، ہو جا
کہیں اندر سے آج بھی توقیر
اک صدا آتی ہے، "مرا ہو جا"

کہیں شعور میں صدیوں کا خوف زندہ تھا
میں شاخِ عصر پہ بیٹھا ہوا پرندہ تھا
بدن میں دل تھا معلق، خلا میں نظریں تھیں
مگر کہیں کہیں سینے میں درد زندہ تھا
پھر ایک رات مجھی پر جھپٹ پڑا، مرا ضبط
جسے میں پال رہا تھا، کوئی درندہ تھا
خوشی نے ہاتھ بڑھایا تھا میری جانب بھی
مگر وہاں، جہاں ہر شخص غم کنندہ تھا
نبردِ عشق میں کیا کیا جگہ کیا توقیر
ہوا کا لمس بھی جب انتقام بندہ تھا

اک شام یوں بھی جشنِ نمو ہو کے رہ گیا
دل اپنا جونہی دھڑکا، لہو ہو کے رہ گیا
اک تو کہ اپنے آپ سے باہر نہ آ سکا
اک میں کہ وجدِ شوق میں تو ہو کے رہ گیا
اک شاخ احتیاط سے گرنے کی دیر تھی
اپنا بدن ہی جیسے عدو ہو کے رہ گیا
سورج سروں تک آنے کی اُفتاد کیا پڑی
توقیر سرد جھونکا بھی لو ہو کے رہ گیا

منیر انور / لیاقت پور

جہاں بھی تھے وہاں پر نہیں تھا میں لیکن
جہاں کوئی بھی نہیں تھا وہاں تو ہونا تھا

ہارون آباد، بہاولنگر میں ۱۶ ستمبر ۱۹۶۲ء کو پیدا ہوئے۔ شعر گوئی کا آغاز ۱۹۸۰ء میں کیا۔ حمد، نعت، غزل، نظم، قطعہ، ثلاثی، ماہیا میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اُردو اور پنجابی زبانوں میں شاعری کرتے ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ "روپ کا کندن" ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ غزل آفرینی، غزل فہمی، ہمارے شاعر، جشن وراں، رحیم یار خان، ادبی جائزہ، سہ ماہی، نالۂ دل، عالمی رنگ ادب، سہ ماہی نوادر، سہ ماہی شعر و سخن، سہ ماہی سفیر اردو، لیوٹن اور ماہنامہ، پرواز لندن، ماہنامہ ماہ نو، سہ ماہی قرطاس میں کلام چھپتا رہتا ہے۔ گیارہ سال تک شعبہ تعلیم سے وابستہ رہنے کے بعد استعفیٰ دے دیا۔ آج کل کمپیوٹرز سیل اینڈ سروس کا ذاتی کاروبار ہے۔

ملا تو دے کے جدائی چلا گیا آخر
ہمارے حصے میں تنہا سفر رہا آخر
اگر یہ طے تھا کہ ہر بات سے مکرنا ہے
تو پھر نباہ کا وعدہ ہی کیوں کیا آخر
اسے خیال تھا کتنا جہان والوں کا
اسی خیال میں جاں سے گزر گیا آخر
تضادِ فکر کا الزام کچھ درست نہیں
کہا تھا میں نے جو اوّل، وہی کہا آخر
وہ میرے درد، مرے غم کو بانٹنے والا
اک اور کرب مجھے دان کر گیا آخر
تمہیں یقین تھا ہم دوستی نبھا لیں گے
مجھے گمان تھا جس کا وہی ہوا آخر
فرازِ دار سے پہلے کا وقت مشکل تھا
کسی کی یاد کے سائے میں کٹ گیا آخر
جب اختیار تھا تم فیصلہ سنا دیتے
تمام عمر تذبذب میں کیوں رکھا آخر
میں اس کے ہاتھ سے نکلا ہوا زمانہ تھا
وہ میری کھوج میں نکلا، بکھر گیا آخر
میں اعتبار کی دنیا سے کٹ گیا انور
کسی کے ساتھ میں اتنا بھی کیوں چلا آخر

حدیثِ درد کو آخر بیاں تو ہونا تھا
جو کرب دل میں چھپا تھا عیاں تو ہونا تھا
وہ پاس رہتے ہوئے فاصلوں کا قائل تھا
اس اہتمام کو پھر داستاں تو ہونا تھا
زمیں کا تاج تھا وہ شخص اپنی ہستی میں
زمیں سے بڑھ کے اسے آسماں تو ہونا تھا
دکھوں کی دھوپ کے اس دورِ بے مروّت میں
مجھے کسی کے لیے سائباں تو ہونا تھا
تجھے یہ کس نے کہا تھا حساب مانگ اس سے
اب ایسی بات پہ جاں کا زیاں تو ہونا تھا
جہاں بھی تھے وہاں پر نہیں تھا میں لیکن
جہاں کوئی بھی نہیں تھا وہاں تو ہونا تھا
جو میں نہ ہوتا سرِ دار، دوسرا ہوتا
کسی کو خلقِ خدا کی زباں تو ہونا تھا
وہ خود پسند، جفا کار شخص تھا انور
نتیجتاً اسے بے کارواں تو ہونا تھا

اک چہرے سے ایک نقاب اُٹھایا ہے
ہم نے ساری محفل کو چونکایا ہے
ہم نے کتنی چاہ سے تانا ہے سینہ
اس نے کتنے پیار سے تیر چلایا ہے
جانے والوں کی ہوتی ہے مجبوری
رونے والوں کو کتنا سمجھایا ہے
اوّل آخر ماتھے پر بل رہتے ہیں
جانے کس مٹی سے بن کر آیا ہے
لگتا ہے پھر کوئی ضرورت آن پڑی
اس نے گھر پر آج مجھے بلوایا ہے
بھوکے ننگے بچوں کی اس بستی میں
ایک کھلونے بیچنے والا آیا ہے
میرے فون پہ لہرایا ہے اس کا نام
لگتا ہے انور وہ راہ پہ آیا ہے

ہے مکمل انہی سے ذات مری
مرے بچے ہیں کائنات مری
زیست جینا محال کر دے گی
یاد آئے گی بات بات مری
میں بس انسانیت کا قائل ہوں
پوچھتے کیا ہو ذات پات مری
اس نے بھی میرا ہاتھ چھوڑ دیا
جس کے ہاتھوں میں تھی حیات مری
اُس نے بس مسکرا کے دیکھا تھا
کھل اٹھی ساری کائنات مری
کس قدر بے مثال سپنا تھا
چین سے کٹ گئی ہے رات مری
تیرے لہجے سے حوصلہ پا کر
گنگنانے لگی حیات مری
جیت کر بھی وہ رو دیا انور
اُس سے دیکھی گئی نہ مات مری

نوید ملک/راولپنڈی

اچھی اور خوبصورت نظمیں لکھی نہیں جاتیں بلکہ وہ خودرو پودوں کی طرح شاعر کے اندر اُگتی ہیں۔ وہ پھولوں والی بیلوں کی طرح اُس کی ذات کے اندر پھیلتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کے ان کے پھول آنکھوں اور ہونٹوں سے باہر آنے لگتے ہیں۔ نوید ملک کی نظمیں میں نے صرف پڑ ھی نہیں بلکہ ان کے اندر اپنا آپ بسر کیا ہے۔ ایک ایک لفظ کو چھو کر دیکھا ہے اُس کی نرماہٹ اور کوملتا کو محسوس کی ہے، جس طرح کسی تاریخی عمارت کی اینٹوں کو چھوا جاتا ہے۔ نوید کی نظموں کے اندر ایک جہانِ معانی ہے۔ یہ سب نظمیں مجھے ایک ہی فیز میں لکھی ہوئی لگتی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا اس نے کوئی بھی نظم کسی منصوبہ بندی کے تحت لکھی ہے یا اُس کی شعوری کوشش کارفرما ہے۔ نظموں اور لائنوں کی بے ساختگی سے اندازہ ہوتا ہے۔ یہ سارا شعری سرمایہ کسی مدفون شہر کی طرح اس کے اندر تھا۔ پھر ایک روز یہ باہر نکل آیا اور نوید نے اُسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا۔ نوید کی نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُس نے جس موضوع پر نظم بنی ہے نظم کی روح اور تقدس کو پامال نہیں ہونے دیا۔ لفظوں کی سادگی اور شگفتگی پر حرف نہیں آنے دیا۔ شعری جمالیات کا خوب خیال رکھا ہے۔ (حسن عباسی)

آئینے میں نادم شخص

پریشاں ہوں
مرے مالک...... مری آنکھوں میں جتنے اشک مرتے
دم تلک باقی ہیں
سارے آج بہہ جائیں
کہ میں نے آئینے
میں آج ایسا شخص دیکھا ہے
جو اس قابل نہیں محشر میں تیرے سامنے
تیرے نبی کا اُمتی ہونے کا دعویٰ کر کے
سجدہ ریز ہو جائے
خدایا......
آئینے میں جس کی آنکھیں نم ہیں
اب وہ نیک ہو جائے

مرا ایمان کامل ہو

تمہارے عشق سے مہکی ہوئی سانسیں
زمین و آسماں تارے
یہ بحر و بر ازل سے لے رہے ہیں
حشر تک لیتے رہیں گے
نعت بھی ہوتی رہے گی
ذکر بھی بڑھتا رہے گا
بس...... دُعا یہ ہے
کہ میرے ہر عمل سے تیری سنت کی مہک آئے
میں ایسے راستے پر گامزن ہو جاؤں
جس میں ہو رضا تیری
مرے آقا
کسی دن تیری اُلفت کے سمندر میں
یہ میرا دل بھی ڈوبے اور......
بہت گہرائی میں جا کر
ترے قدموں کو چھونے کی سعادت مجھ کو حاصل ہو
مرا ایمان کامل ہو

کل

جب یہ پوچھا کہ کب ملو گی تم؟
اُس نے ہنستے ہوئے جواب دیا
اچھا کل، کل نہیں، کسی دن اور
جانے کیا سوچ کر دیے کی طرح
میری اس بات پر وہ بجھنے لگی
سرد لہجے میں گرم جذبات
جانے کیا کیا اشارے کر رہی تھی
بے قراری کی فصل سینے میں
کٹ رہی تھی کہیں اُبھر رہی تھی
اس کے لب سے نکل کے ہر اک لفظ
میری آنکھوں میں خواب بن رہا تھا
میں اسے خامشی سے سن رہا تھا
اُس نے پھر ٹالتے ہوئے یہ کہا
وقت آیا تو دیکھا جائے گا
دیکھتے دیکھتے کئی صدیاں
وقت دریا کے ساتھ بہہ گئی ہیں
بس مری خوا م ہی رہ گئی ہیں
اُس سے ملنے کی آس پر اب تک
خود سے کہتا ہوں کل نہیں آیا

چیک

آج تنخواہ کا "چیک" ملا
لحہ بھر میرے چہرے پہ خوشیوں کی کرنیں بکھرنے لگیں
فون کی گھنٹیوں نے اندھیرے میں بدلا سماں
میں اُداسی کے صحرا میں پل بھر کو خیمے میں تھا
یک دم اپنے پلٹنے پہ اُمید نے
اک سہارا دیا...... ٹھیک ہے
ٹھیک ہے، قرض دینا ہے جن جن کا دے دوں گا میں
شکر ہے مجھ سے شکوہ نہ کوئی کرے گا یہاں
اے مری زندگی
قرض مجھ پر ہیں تیرے بہت
کون سا چیک ملے گا مجھے
میں اتاروں گا قرض بھی

فاطمہ احمد/لاہور

پھولوں کے ساتھ میری اُداسی پہ سوگوار　　خوشبو بھی ہو گئی تو مجھے سوچنا پڑا

فاطمہ احمد کا دل معصوم امنگوں اور آنکھیں سُندر سپنوں سے بھری ہیں۔ وہ جگنوؤں اور تتلیوں کو پکڑتے پکڑتے ادب کے باغیچے میں آ نکلی ہے۔ اس کی شاعری ہلکی ہلکی بارش میں بھیگتے پھولوں کی طرح تازہ اور خوبصورت ہے۔ میں فاطمہ احمد اور اُس کی شاعری کے متعلق صرف اتنا کہوں گا۔ چشم بددور (محسن عباسی)

ایسے میں اس نگر کے منظر کی ہو گئی ہوں
لگتا ہے جیسے میں بھی پتھر کی ہو گئی ہوں
بے چہرگی کے سائے پھیلے ہیں آسماں تک
اُڑتے ہوئے میں شاید بے پر کی ہو گئی ہوں
اس دل کی دھڑکنوں پر یہ بوجھ سا ہے کیسا
دُنیا ہے غم کا محشر، محشر کی ہو گئی ہوں
عورت ہے ذات میری، کیا کائنات میری
بازار سے گزر کر اکثر کی ہو گئی ہوں
شاید کھلی زمیں بھی میرے لیے قفس ہے
دیوار و در سے پہلے میں گھر کی ہو گئی ہوں
کیا فاطمہ ازل سے قسمت ملی ہے مجھ کو
اک در پہ میں کھلی تھی، دو در کی ہو گئی ہوں

خوشبو بکھر کے اور دیاروں کی ہو گئی
حالت خزاؤں جیسی، بہاروں کی ہو گئی
وہ چاند بادلوں میں کہیں چھپ گیا تو کیا
کچھ روشنی نظر کے ستاروں کی ہو گئی
منزل پہ جا کے بھی نہیں منزل سے آشنا
قسمت عجیب راہ گزاروں کی ہو گئی
جنگل کی بود و باش پسند آ گئی اسے
خلقت تمام شہر میں غاروں کی ہو گئی
گرداب کا نصیب فقط ایک میں ہی تھی
دریا کی لہر لہر کناروں کی ہو گئی
تنہائی کی وہ آنچ اٹھی دل سے فاطمہ
ساری فضا ہی جیسے شراروں کی ہو گئی

وہ شکل کھو گئی تو مجھے سوچنا پڑا
بے چین ہو گئی تو مجھے سوچنا پڑا
سینے پہ آ پڑا ہے مرے، دن کا بوجھ بھی
جب رات سو گئی تو مجھے سوچنا پڑا
پھولوں کے ساتھ میری اُداسی پہ سوگوار
خوشبو بھی ہو گئی تو مجھے سوچنا پڑا

کیا معلوم تھا، کب یہ خبر تھی، شہر گماں میں چپکے سے
رستہ رستہ آ نکلوں گی قریۂ جاں میں چپکے سے
تیری خاموش آنکھوں میں نفرت کا منظر جاگے گا
کیا معلوم تھا، زہر گھلے گا تیری زباں میں چپکے سے
کون تھا؟ کیا تھا؟ کیا بتلاؤں؟ کیسے سب کو سمجھاؤں؟
کوئی شامل ہو گیا میری عمر رواں میں چپکے سے
شام کا تھا یا صبح کا تارا، تاریکی میں ڈوب گیا
ایک سکوت سا چھا گیا میرے دل کے جہاں میں چپکے سے
صرف مری آنکھوں نے دیکھا یا دل نے محسوس کیا
صحراؤں کی دُھول اُڑی تھی رات مکاں میں چپکے سے
آج مجھے پھر کس نے پکارا، کس کو میں یاد آئی ہوں
کون چلا آیا میرے اندازِ بیاں میں چپکے سے
فاطمہ دل کا بھید نہ کھول، تو خود کو اتنا بھی مت رول
عمر ہی کٹ جائے تیری چھوٹی سی ہاں میں چپکے سے

سکھی دیکھ! اتنا پیار بھی اچھا نہیں ہے
کہ وہ فطرت میں ہے کچھ اور، تجھ جیسا نہیں ہے
یہاں رستوں کو ناہموار رہنے کی ہے عادت
محبت میں کوئی بھی راستہ سیدھا نہیں ہے
میں اس سے اپنی تنہائی کی قیمت مانگتی کیا
وہ آیا تو ذرا سی دیر بھی ٹھہرا نہیں ہے
سنہرے خواب کی دہلیز سے میں اُٹھ چکی ہوں
کہ خوابوں کا حقیقت سے کوئی رشتہ نہیں ہے
مسلسل ہجر کے تیروں سے چھلنی ہو رہی ہوں
ہیں کتنے تیر باقی؟ اس کا اندازہ نہیں ہے
محبت میں ہو کوئی فائدہ، یہ غیر ممکن
محبت میں ہے کیا نقصان، یہ سوچا نہیں ہے
تو گھر سے فاطمہ احمد نکلنا اب سنبھل کر
یہ دُنیا اور ہے کوئی، تری دُنیا نہیں ہے

مری آنکھ دھوپ پر ہے، مرا رنگ خوشبوؤں میں
میں ہوں موم کی وہ گڑیا جو پڑی ہے راستوں میں
مرے دل کی دھڑکنوں پر، ذرا ہاتھ رکھ کے دیکھو
کہ بھرا ہے پیار کتنا، مرے دل کے موسموں میں
مری بات پر نہ جاؤ، مری سوچ میں تو اُترو
کہ اُتر گیا ہے کب سے، ترا غم مری رگوں میں
مری رُوح میں اُتر کر مری ذات کو تو سمجھو
میں ہوں عکس عکس روشن، کبھی دیکھ آئنوں میں
تری چاہ کے سفر میں، میں سمٹ کے رہ گئی ہوں
تو بکھر بکھر گئی ہوں کئی غم زدہ دلوں میں
پڑے دل پہ غم کے سائے، مجھے تم ہی یاد آئے
کوئی رنگ نفرتوں کا جو ملا محبتوں میں
یہاں کوئی فاطمہ اب مرے چاند کو بلائے
کہ ہے روشنی بہت کم ابھی رات کے دیوں میں

لبنیٰ صفدر / گوجرانوالہ

ہر ایک کارِ نفس میں سنائی دینے لگا
پھر اس کے بعد وہ مجھ میں دکھائی دینے لگ

مشرقی لڑکی خموش جھیل کی طرح ہوتی ہے جس کے پانیوں میں پھول کم اور پتھر زیادہ ہوتے ہیں۔ جب بھی جبر اور استحصال کا پھینکا ہوا کوئی پتھر پانیوں پہ تیرتا ہوا اُس کی ذات کے اندر ڈوبتا ہے۔ ردِعمل کے طور پر لہروں کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ لبنیٰ صفدر کی شاعری نے بھی لہروں کے اسی دائرے سے جنم لیا ہے۔ جس طرح جھیل کی ہلکی ہلکی لہروں کا سفر کناروں تک پہنچنے سے پہلے ہی تمام ہو جاتا ہے اس طرح لبنیٰ کا اظہار مکمل ہونے سے پہلے ہی اُس کے شعروں میں دم توڑ دیتا ہے۔ وہ ایک بچھڑی ہوئی، ڈری ہوئی اور سہمی ہوئی کونج کی طرح اپنی شاعری کے بن میں کرلاتی تو ہے لیکن یہ کرلاہٹ دکھ کی شدت سے اُس کے اندر ہی کہیں دب کر رہ جاتی ہے۔ لبنیٰ کسی بھی موضوع پر شعر کہے دُکھ کی ایک زیریں لہر اُس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ یہ دُکھ ہر اُس مشرقی لڑکی کی ذات کا حصہ ہے جس کا ایک پاؤں معاشرتی جبر اور دوسرا پاؤں آزادیٔ اظہار کی سیڑھی پر پڑتا ہے۔ (حسن عباسی)

وہ جس سے بس ذرا سا واسطہ ہے
مجھے کمزور کرنے میں لگا ہے
ذرا سا راستہ اے زندگی بھی
یہاں پر دائرے میں دائرہ ہے
تعلق میں دراڑیں پڑ گئی ہیں
ہمارے درمیاں اک تیسرا ہے
تمھیں تو لفظ سننے کی ہے عادت
پڑھو! اس آنکھ میں بھی کچھ لکھا ہے
مسلسل گھنٹیاں سی بج رہی ہیں
سنہری دن گزرتا جا رہا ہے
بہت جلنے لگی ہیں میری آنکھیں
تمہاری یاد ہے اور رت جگا ہے
وہ جس دن سے ملا ہے مجھ سے لبنیٰ
ستارا مجھ میں لو دینے لگا ہے

درمیاں پردہ نہ پھر کوئی بھی حائل رکھا
اس طرح چاہا اُسے خون میں شامل رکھا
اک اشارہ تھا کسی آنکھ کا رستے جیسا
ایک چہرہ تھا جسے حاصلِ منزل رکھا
جب جواں ہونے لگی پاؤں کو زنجیر کیا
نام جس لڑکی کا ماں باپ نے پائل رکھا
اس نے کشکول میرے ہاتھ کو بننے نہ دیا
ایک در کا میرے رب نے مجھے سائل رکھا

ایک ہی خواب دریچہ تھا جہاں پر لبنیٰ
اپنی آنکھیں بھی وہیں رکھیں وہیں دل رکھا

اُس سے رشتہ بحال رکھا ہے
گرچہ غم نے نڈھال رکھا ہے
ہم نے اتنا خیال رکھا ہے
تیرا غم تک سنبھال رکھا ہے
موسمِ گل میرا کب آئے گا
شاخِ لب پر سوال رکھا ہے
اپنی قسمت میں اک صدف بھی نہیں
اک سمندر کھنگال رکھا ہے
نیند اک مسئلہ نہیں میرا
روگ تو نے بھی پال رکھا ہے
کرچی کرچی دکھائی دیں چہرے
آئینہ بھی کمال رکھا ہے
تیری تصویر سے ہیں شیلف بھرے
دل دُکاں میں یہ مال رکھا ہے
آخر ہونا تو ہے جدا لبنیٰ
بس ذرا کل پہ ٹال رکھا ہے

اس طرح تیری طرف داری نہیں کر سکتی
اب محبت میں اداکاری نہیں کر سکتی
عشق کے بیج کو سینے میں نہیں سینچوں گی
اب نئی کوئی شجر کاری نہیں کر سکتی

کیوں اُسے کال کروں اتنی انا ہے مجھ میں
دل میرے تیری میں دلداری نہیں کر سکتی
میں اثر سے تیرے اب دور نکل آئی ہوں
خود پہ افسوں تیرا میں طاری نہیں کر سکتی
لاکھ آسائشیں ہوں دور کے منظر میں مگر
اپنی اس خاک سے غداری نہیں کر سکتی

ہوائے ہجر میں خود کو غبار کرتے ہوئے
بکھر رہی ہوں تیرا انتظار کرتے ہوئے
یہ اپنے نام کے ہجے بھی ہم کو بھول گئے
تری اَنا کو ذرا باوقار کرتے ہوئے
تمہارا نام ستاروں پہ لکھتی رہتی تھی
یہ عمر کاٹ دی تارے شمار کرتے ہوئے
کسی کنارے پہ کوئی بھی منتظر نہ ملا
ہر ایک بار یہ دریا کو پار کرتے ہوئے
میں مطمئن کہ صداؤں سے بھر گیا آنگن
اکیلے ایک پرندے کو ڈار کرتے ہوئے
کبھی تو لبنیٰ یہ چاہوں کہ کھلکھلا کے ہنسوں
خود اپنے آپ کو یوں سوگوار کرتے ہوئے

دل میں تیرے ملال کیوں آیا
اُجلے شیشے پہ بال کیوں آیا
ہے محبت تو اس کے ماتھے پر
یوں لکیروں کا جال کیوں آیا

مسرت یاسمین/لاہور

جفا بھی کرتے رہے، ہاتھ بھی ملاتے رہے
عجیب لوگ تھے یوں بھی مجھے ستاتے رہے

اردو شاعری کے اُفق پر ایک نئے ستارے نے ظہور کیا ہے۔ مسرت یاسمین نے جذبے کی سچائی کو لفظ کی حرمت کے ساتھ آمیز کر کے خوبصورت شاعری تخلیق کی ہے۔ یہ ان کی پہلی کاوش ہے لیکن جہاں وہ عروضی موشگافیوں سے بخوبی نبرد آزما ہوئی ہیں۔ وہیں انہوں نے تخلیقی ندرت کو بھی کمال سلیقے سے برتا ہے۔ یہ بھی اہم بات ہے کہ انہوں نے ذاتی واردات کے علاوہ ملکی حالات پر بھی دردمندی سے قلم اُٹھایا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس مجموعے کو قبولیت، مزید منازل طے کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔

دشمنِ جاں نہ بنو ہوش میں آؤ لوگو!
اپنا ایماں نہ سرِ راہ گنواؤ لوگو!
قہر ڈھاؤ نہ زبانوں کو بنا کر تلوار
میں تو بے بس ہوں مجھے تم نہ ستاؤ لوگو
حوصلہ مجھ میں نہیں جور و ستم سہنے کا
میں ہوں ملزم، مجھے مجرم نہ بناؤ لوگو!
تم پہ ہی آن پڑے ایسے نہ حالات کرو
کچھ خدا کا بھی کوئی خوف تو کھاؤ لوگو
رُوٹھ جائیں گے بھری زیست سے ہم بھی اِک دن
موت کا رقص نہ تم آج دکھاؤ لوگو!
عشق کے واسطے مشعل ہے مری رُوح مگر
دل ہے کعبہ تو اسے یونہی نہ ڈھاؤ لوگو
میں مسرت ہوں مرا کام ہے ترسیلِ خوشی!
نفرتوں کے نہ یہاں دیپ جلاؤ لوگو

میرے جذبوں کا حوصلہ تھا وہ
منتوں سے مجھے ملا تھا وہ
آسرا تھا وہ سونی راہوں کا
ہر قدم ساتھ ہی چلا تھا وہ
جانتا تھا وہ میرے دل کی لگی
مرے رازوں سے آشنا تھا وہ
وہ مرا مان تھا، بھرم تھا مگر
خود سے کچھ کچھ اُلجھ گیا تھا وہ
وقتِ رُخصت وہ گیا گم صم
جانے کیا بات سوچتا تھا وہ

خوب گزرے تھے دن رفاقت میں
کیوں کہوں میں کہ بے وفا تھا وہ
جانے اب کب ملے گا کس رُت میں
یک بیک ہی بچھڑ گیا تھا وہ

ہر راستہ انجان تھا، تیرے بغیر!
یہ دل بہت ویران تھا، تیرے بغیر
آباد ہے تجھ سے مرے دل کا نگر
سونا تھا، یہ سنسان تھا، تیرے بغیر
تو رُوح بن کر آ گیا تو جسم ہے
ورنہ تو یہ بے جان تھا، تیرے بغیر
کیا فصلِ گل جب تو نہیں تھا ہم سفر
بکھرا ہر اِک ارمان تھا، تیرے بغیر
اے یاسمیں تو ہے بہاروں کی امیں
کیا غم زدہ انسان تھا، تیرے بغیر

زمانے والوں کو قصہ بہت عجیب لگا
وہ دور رہ کے بھی اکثر بہت قریب لگا
تھا مسکرانے کا انداز اجنبی کی طرح
وہ شخص غیر تھا مجھ کو مگر حبیب لگا
وہ بن کے میرا مقدر ملا تھا برسوں میں
بچھڑ گیا تو مجھے اپنا یہ نصیب لگا
اگرچہ دولتِ دنیا میں کھیلتا تھا مگر
عجیب شخص تھا دل کا بہت غریب لگا

پکڑ لیا جو مرا ہاتھ اُس نے چاہت سے
سکونِ قلب ملا مجھ کو وہ طبیب لگا

رہِ وفا میں ستائے ہوئے تو تم بھی ہو
جگر پہ چوٹ ہی کھائے ہوئے تو تم بھی ہو
الگ نہیں ہو زمانے سے اے مرے ہمدم
متاعِ جاں کو گنوائے ہوئے تو تم بھی ہو
زباں کا زخم کسی طور بھر نہیں پاتا
اگرچہ خود کو بچائے ہوئے تو تم بھی ہو
یہ قہر ڈھایا ہے مجھ پر بھی اک ستمگر نے
فریبِ دوستی کھائے ہوئے تو تم بھی ہو
چلی ہے چال زمانے نے مکر و فن کی بہت
کسی کی چال میں آئے ہوئے تو تم بھی ہو
طلوعِ صبحِ مسرت کی منتظر ہوں مَیں
سحر کی آس لگائے ہوئے تو تم بھی ہو

کیا ہے حسین چہرہ، اشکوں سے جو دُھلا ہے
لگتا ہے درد کوئی، گہرا اسے ملا ہے
وہ دوست ہے کہ تیرا دشمن کوئی سراسر
دل کا بھی وہ برا ہے، پھر بھی وہ باوفا ہے؟
دل بجھ گیا ہے میرا، یوں دیکھ کر تجھے کیوں؟
جانے یہ بات کیا ہے اور کیا یہ ماجرا ہے
خوشیاں یونہی ہزاروں ہیں تیرے ساتھ ہر دم
تقدیر تیری سنورے میری یہی دُعا ہے

تبصرۂ کتب

اِک عمر کی مہلت

مصنف: افضل خاں صفحات: ۱۴۴ قیمت: ۲۵۰ روپے تبصرہ: نازاوکاڑوی

ناشر: نزول پبلی کیشنز گوجرہ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ

جدید غزل کے معروف شاعر افضل خان کا تازہ شعری مجموعہ ''اک عمر کی مہلت'' دیدہ زیب گیٹ اپ میں شائع ہو گیا ہے۔ جدید غزل سے محبت کرنے والے شعری حلقے کو اس مجموعے کا شدت سے انتظار تھا۔ افضل خان نے بہاولپور میں بیٹھ کر ایسی خوبصورت غزلیں تخلیق کیں کہ مجموعہ کی اشاعت سے قبل ہی اُن کی خوشبو بڑے ادبی مراکز تک پہنچ گئی تھی۔ اُمید ہے یہ شعری مجموعہ ادبی اور عوامی حلقوں میں یکساں طور پر پسند کیا جائے گا۔

عرض

مصنف: مامون ایمن (نیویارک) صفحات: ۱۲۴ قیمت: ۳۰۰ روپے

ناشر: خلوص نگر، نیویارک تبصرہ: نازاوکاڑوی

مامون ایمن اگرچہ طویل عرصہ سے امریکہ (نیویارک) میں مقیم ہیں۔ مگر اُن کا نام بطور استاذ الشعراء اور رُباعی کے فن میں کمال کے سبب ہندو پاک میں اپنی ایک خاص شناخت رکھتا ہے۔ ''عرض'' اُن کی رباعیات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے حج کا فریضہ ادا کرنے کے دوران لکھیں۔ اللہ تعالیٰ کا ان پر خاص کرم ہوا اور رباعیات کی فارم میں اتنی پُر تاثیر اور عقیدت سے لبریز نعتیں لکھنے کی مثال اس سے قبل اُردو شاعری میں نہیں ملتی۔ مامون ایمن کا یہ مجموعہ اس حوالے سے نہایت اہم ہے۔

مصر کی رقاصہ

ترتیب وتدوین: حمیرا اشفاق صفحات: ۸۸ قیمت: ۱۶۰ روپے تبصرہ: نازاوکاڑوی

ناشر: سانجھ پبلی کیشنز بک سٹریٹ 46/Z مزنگ روڈ، لاہور

مصر قدیم تہذیبوں میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ جہاں اور بہت سی چیزیں وجہ شہرت ہیں تو وہاں بیلے ڈانس بھی اپنی ایک علیحدہ اور منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اسی تناظر میں میں فرانس کے ناول ''تائس'' سے ماخوذ موسیو گیلے نے اوپیرا کی شکل میں پیش کیا۔ بعد میں پطرس بخاری نے ترجمہ کر کے اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ فیض احمد فیض کتاب ''مصر کی رقاصہ'' میں لکھتے ہیں۔ بخاری صاحب اور ان کا ترجمہ تعریف اور توصیف سے بہت بالا ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید او رمیرے لیے عطاری کا دعویٰ کرنا بھی گستاخی ہے۔ واقعی اس کے بعد کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں۔ مزید برآں حمیرا مشتاق کی کاوش بھی قابل تحسین ہے۔ ایسے خشک موضوع کو ترتیب دے کر اپنی فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ مصنفہ کا ادبی حلقہ میں ایک خاص مقام ہے۔

جدید اُردو فکشن

مصنف: حمیرا اشفاق صفحات: ۱۸۳ قیمت: ۲۵۰ روپے تبصرہ: نازاوکاڑوی

ناشر: سانجھ پبلی کیشنز، بک سٹریٹ ۲/۴۶ مزنگ روڈ لاہور

حمیرا اشفاق نے اُردو ادب میں جدید اُردو فکشن پر مدلل تحقیق کرتے ہوئے روشنی ڈالی ہے۔ حمیرا اشفاق کہتی ہیں میرے نزدیک تحقیق وتنقید وہ علمی کام ہے جو درباروں میں سربسجود ہونے کی بجائے دست قاتل کو جھٹک دینے کی بات کرتا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب پانچ ابواب پر شامل ہے۔ افسانہ کی ابتداء سے لے کر جدید شکل تک کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اُردو ادب میں یقیناً قابل تحسین کارنامہ ہے۔ قاری کو مکمل معلومات فراہم کرتے ہوئے پڑھنے کی دل کشی کا سامان موجود ہے۔

فکری ونظری مباحث

ترتیب وتدوین: حمیرا اشفاق صفحات: ۵۲۸ قیمت: ۸۰۰ روپے تبصرہ: نازاوکاڑوی

ناشر: سانجھ پبلی کیشنز، بک سٹریٹ 46/Z مزنگ روڈ، لاہور

زیرِ نظر مجموعہ ترقی پسند تنقید کے فکری اور نظری پہلوؤں کو اُجاگر کرتا ہے۔ ہم نے اس میں متوازن اور انتہا پسند دونوں تحریروں کو شامل کیا ہے تاکہ آج کا قاری اور ادب کا طالب علم ان کا بے لاگ جائزہ لے سکے اور ان کے حقیقی مقام کا تعین کر سکے۔ اس کتاب کے مضامین انجمن ترقی پسند مصنفین کے ترجمان جرائد، نیا ادب، سویرا، ادب لطیف، نقوش، شاہراہ سنگ میل سے مرتب کیے گئے ہیں۔ ترقی پسند ادب کی نظریاتی اساس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آج کا قاری ان تمام نظریات ومباحث کی روح سے بھی واقف ہو۔ اس ضمن میں یہ کتاب ادب کے قارئین اور طالب علموں کو ترقی پسند تنقید کی گہرائی کو سمجھنے میں معاونت کرے گی۔ یہاں حمیرا اشتاق کی کاوش کو نہ سراہنا بھی زیادتی ہوگی۔ مصنفہ نے بڑی انتھک محنت اور جانفشانی سے اردو ادب میں فکری ونظری بحث کر کے ایک نئے دور کا اضافہ کیا ہے۔ حمیرا اشفاق یقیناً داد کی مستحق ہے۔

انسان کہاں جائے

مصنف: صفدر حسین جعفری صفحات: ۱۶۰ قیمت: ۲۰۰ روپے تبصرہ: نازاوکاڑوی

ناشر: سید مدثر صفدر بیڈفورڈ (یو۔کے)

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ''انسان کہاں جائے'' جتنا اچھوتا ہے اتنا ہی تجسس بھی۔ نام پڑھ کر انسان اندازہ کرنے لگتا ہے کہ انسان پر کیا گزری ہوگی جو انہیں کہنا پڑا۔ ''انسان کہاں جائے'' آیئے دیکھتے ہیں اسلم کولسری صاحب صفدر حسین جعفری کی کتاب کے بارے میں کیا رائے دیتے ہیں۔ کولسری صاحب کہتے ہیں ''انہوں نے یعنی شاعر نے جو محسوس کیا، لکھا ہے۔ خوبصورتی سے لکھا اور پرتاثیر انداز میں لکھا۔ دل سے بات کی اور دلوں میں اُتار دی۔'' اسی طرح اس غزلوں کے مجموعہ کے بارے میں جناب جمیل یوسف یوں رقم طراز ہوتے ہیں۔ ''میری نظر میں ان کی غزل ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی اظہار کے کمال تک آ پہنچی ہے۔ ان کی غزل میں غزل گوئی کے نئے امکانات روشن ہو رہے ہیں۔''

میرے پاؤں جل رہے ہیں (نظمیں)

مصنف: صفدر حسین جعفری   صفحات: ۱۹۲   قیمت: ۲۰۰ روپے

تبصرہ: نازاو کاڑوی   ناشر: سیّد مدثر صفدر بیڈفورڈ (یوکے)

سیّد صفدر حسین جعفری کی نظموں کا مجموعہ ''میرے پاؤں جل رہے ہیں'' منظر عام پر آیا ہے۔ مصنف کے یکے بعد دیگرے دو مجموعہ شائع ہوئے ہیں۔ شاعری میں اکثر دل کے جلنے کی تشبیہات ملتی ہیں عموماً شاعری قلبی واردات ہی ہوتی ہے۔ اس لیے پہلے دل ہی جلتا ہے لیکن صفدر حسین صاحب نے ''میرے پاؤں جلتے ہیں'' نام رکھ کر ایک انفرادیت قائم کی ہے۔ جمیل یوسف صاحب رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں ''صدر حسین جعفری کا یہ تخلیقی شعری ادراک ان کی تمثالی پیکر تراشی کے حوالے سے قاری کو ن، م، راشد، میراجی، اختر الایمان کی یاد دلاتا ہے۔ مگر ان کا اسلوب اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ مزید برآں اختر حسین جعفری کی رائے کچھ یوں ہے۔ ''رواں صدی کی آٹھویں دہائی کے آغاز میں جن شعراء نے اپنے تخلیقی عمل کی قوت سے اہل ادب کو بطور خاص متوجہ کیا ان میں صفدر حسین جعفری کو منفردیت حاصل ہے۔ محسوسات کو سید صفدر حسین جعفری نے یکسر جداگانہ نوعیت کے شعری پیکر اور تمثالی ڈھانچے عطا کیے ہیں اور پھر یہ کہ ان کے ان تخلیقی نمونوں پر خود ان کے نام کی مہر ہے۔

زہریلے پھول (افسانے)

مصنف: گل زیب عباسی   صفحات: ۲۰۸   قیمت: ۳۰۰ روپے

تبصرہ: نازاو کاڑوی   پبلی شرز: رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی

افسانوں کا مجموعہ حال ہی میں چھپ کر مارکیٹ میں آیا ہے۔ پھولوں کو ہمیشہ خوبصورتی اور خوشبو سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن مصنف نے پھولوں کو زہر سے نہ جانے کیوں تشبیہ دے ڈالی۔ یہ تو کتاب پڑھ کر ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ گل زیب عباسی صاحب کی بشمول ''زہریلے پھول'' چھ کتابیں قارئین سے داد تحسین پا چکی ہیں۔ ان میں سے ایک پنجابی مجموعہ ''عشق پریتاں'' کو بھی بہت پسند کیا گیا۔ ''زہریلے پھول'' کے بارے میں ڈاکٹر اختر ہاشمی صاحب کا کہنا ہے ''ہر پڑھا لکھا شخص قلم ہاتھ میں تھام کر تحریر کرسکتا ہے مگر وہ شخص جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے لکھنے کی صلاحیت دی ہو اور اس کے ہاتھ قلم تھما دیا ہو اس میں فرق ہوتا ہے۔ گل زیب عباسی کا شمار ان اشخاص میں ہوتا ہے جن میں خداداد صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح شاعر علی شاعر کی رائے میں گل زیب عباسی اپنے تلخ وشیریں تجربات اور عمیق مشاہدات کو قرطاس پر منتقل کرتے ہیں تو افسانہ بن جاتا ہے۔ اگر وہ اسی تسلسل کے ساتھ لکھتے رہے تو ان کا اچھے اور بڑے افسانہ نگاروں کی فہرست میں شمار ہونے لگے گا۔ قارئین کو پڑھنے کے لیے کہوں گا۔ یقیناً آپ لطف اندوز ہوں گے۔

اپنی کتاب کی معیاری اور دیدہ زیب اشاعت کے لیے رابطہ کریں:

نستعلیق مطبوعات

ایف ۳ - فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

0300-4489310 / 0423-7351963 nastalique786@gmail.com

''حرفِ جعفر''

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک کے زیرِ ادارت فیصل آباد سے چھپنے والا ماہنامہ ''حرفِ جعفر'' چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا ہے۔ اس شمارے میں حمد، نعت کے علاوہ فیصل آباد میں مقیم شعراء کے مختصر تعارف کے ساتھ غزلیں موجود ہیں۔ جو قارئین ادب کی پیاس بجھانے میں معاون ہو سکتی ہیں۔

نوید انور کو صدمہ

دبئی میں مقیم اُردو اور پنجابی کے معروف شاعر نوید انور کے والد گزشتہ دنوں لاہور میں انتقال کر گئے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ادارہ نوید انور کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

ندیم اظہر ساگر کی دبئی روانگی

لاہور کے معروف شاعر ندیم اظہر ساگر بسلسلہ روزگار مستقل طور پر دوبئی چلے گئے ہیں۔

اک دیا اک دریا

کینیڈا میں مقیم معروف شاعرہ تن دیپ تمنا کا پہلا شعری مجموعہ ''اک دیا اک دریا'' بھارت سے شائع ہو گیا ہے۔ بھارت، کینیڈا اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں اس شعری مجموعے کا شدت سے انتظار تھا۔ بہت جلد پاکستان سے بھی شائع ہو گا۔

زاہد سعید اور فرحت زاہد کا عشائیہ

معروف شعراء زاہد اور فرحت زاہد نے بیرون ملک سے آئے ہوئے شعراء جواد شیخ (اوسلو)، شوکت علی ناز (دوحہ) اور اور ناز اوکاڑوی (کویت) کے اعزاز میں Ze Grill ای ایم ای سوسائٹی میں ایک عشائیے کا اہتمام کیا جس میں حسن عباسی اور علی رضا نے بھی شرکت کی۔ اس موقع پر تمام شعراء نے اپنا کلام بھی پیش کیا۔

سیّد صفدر حسین جعفری کے اعزاز میں شعری نشست

معروف شاعر سیّد صفدر حسین جعفری کے اعزاز میں اعتراف انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام ایک شعری نشست کا اہتمام کیا جس کی صدارت جمیل یوسف نے کی۔ جبکہ مہمان خصوصی سید صفدر حسین جعفری تھے۔ جن شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا اُن میں افتخار اشعر، سعد قمر، اقبال پیام، عدنان بشیر، حماد نیازی، حسن عباسی، سلیم گورمانی، عبدالمجید چٹھہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ صاحب صدر جمیل یوسف نے سید صفدر حسین جعفری کی فن و شخصیت سے متعلق بھرپور گفتگو کی آخر میں سیّد صفدر حسین جعفری نے اپنا خوبصورت کلام پیش کیا اور شعراء میں کتب تقسیم کیں۔ یہ مشاعرہ قائداعظم پبلک لائبریری کے ہال میں منعقد ہوا جس میں ڈی جی قائداعظم لائبریری نے خصوصی طور پر شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔

معروف شاعرہ رابعہ رحمٰن کو صدمہ

معروف شاعرہ اور متعدد شعری مجموعوں کی خالق رابعہ رحمٰن کی والدہ گزشتہ دنوں خالق حقیقی سے جا ملیں۔ ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ تمام احباب سے مرحومہ کے ایصالِ ثواب کے لیے دُعا کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

مقبول نعتوں کے خالق برصغیر کے نامور اُستاد شاعر حضرت پرنم الٰہ آبادی کی چوتھی برسی

مقبول نعتوں کے خالق برصغیر کے نامور استاد شاعر حضرت پرنم الٰہ آبادی کی چوتھی برسی بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ منائی گئی۔ میانی شریف صاحب میں آپ کے مزار شریف پر غسل، چادر پوشی کی گئی اور باقی تقریبات آپ کے خاص شاگرد اقبال پیام شجاع آبادی کی زیرِ نگرانی بزمِ پرنم ذکرِ میلاد مصطفیٰ انٹرنیشنل 7 آبکاری روڈ نیو انارکلی لاہور میں محفلِ میلاد، ختم شریف، محفل سماع اور محفل مشاعرہ منعقد ہوا۔ محفل مشاعرہ کی صدارت زبیدہ حیدر زیبی، مہمان خاص واجد امیر، ذاکر خواجہ، نظامت حکیم سلیم اختر اور دیگر شعراء کرام نے کلام پڑھا اور اقبال پیام نے آپ کی زندگی

اور ادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور آپ کے مشہور زمانہ کلام سے زائرین کو متعارف کروایا۔ تلاوت پاک کی سعادت علی قادری صاحب نے حاصل کی۔ نقابت کے فرائض عمران نقیبی نے انجام دیے۔ اس موقع پر مشہور ثنا خواں پی ٹی وی پروڈیوسر علی رضا نے استاد پرنم کا کلام پڑھا۔ حافظ عامر سلیم قادری نے شان اولیاء پر خصوصی خطاب فرمایا۔ تقریب کے صدر اقبال پیام شجاع آبادی نے اپنے استاد کے لیے ہدیہ عقیدت اور استاد کے نعتیہ اشعار پڑھے۔ تقریب کے اختتام پر مہمان خصوصی سید بابا سہا گل شاہ صاحب نے ختم شریف اور دعائے خیر کروائی۔ اقبال پیام شجاع آبادی، شیخ اقبال محمد اجمل، شیخ جمشید، مقصود علی، حبیب افضال نے برسی کے سلسلہ میں بہترین انتظام کیا اور تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

''آج'' (کتابی سلسلہ)

کتابی سلسلہ ''آج'' کا ۷۷ واں شمارہ شائع ہو گیا ہے۔ تازہ شمارے میں حمید شیخ کا ناول ''گینڈا پہلوان'' الف رسل کی خودنوشت کا دوسرا حصہ ''کچھ کھویا کچھ پایا'' اور ذکریہ مشہدی کی تصنیف ''پارسا بی بی کا بگھار'' کے علاوہ ''شاندو تارڑ'' کے نام سے ایک کہانی بھی شامل ہے۔ جس کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کمال ابدالی نے کیا ہے۔ شمارے میں فرانسیسی ادیب، الفونس دورے کی ایک کہانی بھی شامل اشاعت ہے۔ یہ ایک بچے کی دلچسپ سرگزشت اور مختصر تعارف بھی شامل ہے۔ آج میں شامل تحریریں، اُردو ادب کا ایک انمول سرمایہ ہیں۔ جنہیں کتابی شکل میں یکجا کر دیا گیا۔

فنون

نیر حیات قاسمی اور ڈاکٹر ناہید قاسمی کی ادارت میں سہ ماہی ''فنون'' کا ۳۶۸ صفحات پر مشتمل شمارہ دیدہ زیب سرورق کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ اس شمارے کو چار حصوں یعنی حمد و نعت، مضامین، افسانے، نظمیں اور غزلیں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ''فنون'' پاکستان کے ساتھ غیر ممالک میں بھی بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ جدید ادب کا یہ اشاریہ تاریخی حیثیت اختیار کر گیا ہے جس میں ڈیڑھ سو ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات شامل کی گئی ہیں۔ تمام مصنفین بین الاقوامی سطح پر جانے اور پہچانے جاتے ہیں جن میں ڈاکٹر جمال نقوی، شفیع عقیل، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، طاہرہ اقبال، آفتاب اقبال، شمیم، امین راحت، امجد اسلام امجد، ستیہ پال آنند، الطاف فاطمہ، خالدہ حسین، اشرف جاوید، خالد اقبال یاسر، شبنم شکیل، پیرا کرم، نفیسہ قاسمی، مستنصر حسین تارڑ اور سید منظور حسین یاد کے نام نمایاں ہیں۔

گل بوٹی کی تقریب رونمائی

دیار غیر میں مقیم خوبصورت لہجے کی شاعرہ ثمینہ رحمت کے دوسرے شعری مجموعہ ''گل بوٹی'' کی تقریب منعقد ہوئی۔ صدارت افسانہ نگار، شاعر اور ناول نویس احمد عقیل رُوبی اور مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد اجمل نیازی۔ راجا نیر نے منظوم کلام کے ذریعے ثمینہ رحمت کو خراج تحسین پیش کیا۔ جبکہ ڈاکٹر اجمل نیازی، علی اصغر عباس، عبدالمجید چٹھہ، ڈاکٹر صغرا صدف، اصغر شاہ مقررین میں شامل تھے۔

رائٹرز کلب کا مشاعرہ

رائٹرز کلب جوہر ٹاؤن کے زیر اہتمام شاعرہ فریدہ خانم کی کتاب کی تقریب پذیرائی و محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت نامور شاعر نذیر قیصر نے کی۔ مہمان خاص سلیم اختر، اظہار رائے و شاعری شاہد بخاری، ملک مہر خان، خواجہ ذاکر، زاہد نبی، عبدالمجید، نگہت اکرم، اشرف محمود، زیب و نساء، علی ہاشمی نے کی۔

دست چراغ کی تقریب پذیرائی

ادبی تنظیم ادب سرائے کے زیر اہتمام زاہد شمسی کی کتاب ''دست چراغ'' کی تقریب پذیرائی ۲۴ جون بروز پیر فیض گھر میں منعقد ہوئی۔ صدارت احمد عقیل رُوبی، گفتگو ڈاکٹر عالم خان، محمد سلیم طاہر، حسین مجروح، اقبال راہی، اشرف جاوید اور فرحت عباس شاہ نے کی۔

محفل مشاعرہ

ادبی تنظیم ''میواتی دُنیا'' کے زیر اہتمام ایک محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ یہ مشاعرہ ''میواتی دُنیا'' کے دفتر گلبرگ میں ہوا۔ جس میں شعراء کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

عالمی اُردو مرکز

عالمی اُردو مرکز کی مجلس عاملہ کے رُکن اور معروف شاعر جناب محسن علوی کی والدۂ محترمہ رضائے الٰہی سے کراچی میں انتقال کر گئیں۔

اناللہ وانا الیہ راجعون

اللہ رب العزت مرحومہ کو جنت الفردوس میں بلند درجات سے نوازے اور لواحقین کو صبر و جمیل عطا فرمائے۔ آمین ادارہ ارژنگ محسن علوی کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

انور مسعود کو مبارک

الخیر رائٹرز کلب، اسلام آباد کے زیر اہتمام ڈاکٹر انعام الحق جاوید کی صدارت میں ہونے والے ایک خصوصی اجلاس میں اُردو، پنجابی اور فارسی زبان کے بین الاقوامی شہرت کے حامل شاعر اور ادیب پروفیسر انور مسعود کو ان کی علمی، تدریسی اور ادبی خدمات پر روٹری کلب، اسلام آباد کی جانب سے ملنے والے گولڈ میڈل ایوارڈ پر انہیں دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دی ہے۔ اجلاس میں پروفیسر راشدہ مبین، ملک سلیم اختر، ڈاکٹر جاوید حیدر سید، اصغر عابد، پروفیسر نکہت سیما، شیدا چشتی، انجم خلیق، احمد محمود الزماں، وفا چشتی اور ثقلین صیغم نے شرکت کی۔

بک رائٹرز کلب کی تقریب

بک رائٹرز کلب کے زیر اہتمام ممتاز ترقی پسند ادیب، کالم نگار اور صحافی حمید اختر کی ۸۹ ویں سالگرہ کے موقع پر تقریب منعقد کی گئی جس میں ان کی صحافتی اور ادبی خدمات پر زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ تقریب کی صدارت بک رائٹرز کلب کے چیئرمین رانا عبدالرحمٰن نے کی۔ جبکہ بک رائٹرز کلب کے سیکرٹری جنرل ایم سرور نے نظامت کے فرائض سرانجام دیے۔ تقریب میں حمید اختر کی سالگرہ کا کیک کاٹا گیا۔ تقریب میں اختر حیات، پروفیسر راشد حسن رانا، خالد یزدانی، ملک اشفاق، زاہد مسعود، ایم سرور، نوید پشکن، محمد انور اور رانا عبدالرحمٰن نے شرکت کی۔

اُردو اکادمی جھنگ کی نشست

اُردو اکادمی کی پندرہ روزہ نشست ہر دلعزیز شاعر صفدر سلیم سیال کی صدارت میں ہوئی۔ جبکہ مہمانِ خصوصی کہانی کار حنیف باوا اور مہمانِ اعزاز انیس انصاری تھے۔ سٹیج سیکرٹری نوجوان نظم گو عامر عبدالصمد تھے۔ نشست کے آغاز میں صفدر سیال نے کراچی میں شہید ہونے والے اظفر رضوی اور لاہور کے بے مثال نغمہ نگار ریاض الرحمٰن ساغر کے لیے دعائے مغفرت کروائی اور سلیم کوثر کے لیے دعائے صحت کی اپیل کی۔ اس نشست میں گستاخ بخاری، انیس انصاری، صفدر سیال کے علاوہ حقیقت باوا، ڈاکٹر محسن مگھیانہ، غافر عالم، عصمت اللہ، اسحاق کھرل اور بشیر لنگاہ نے اپنا کلام پیش کیا۔ جبکہ قیصر زبیری نے اپنا مضمون پڑھا۔

''ملاقات'' کا عمومی اجلاس

''ملاقات'' کا عمومی اجلاس حسب روایت حسام حر کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا۔ صدارت اقبال سکندر نے کی اور شرکا میں ناصر علی، سید عزیز اعجاز، ڈاکٹر تاج الدین تاجور، اویس قرنی، شہاب الدین خٹک، فریدون خان، فاروق جان، بابر آزاد، سعید پارس، عمر قریشی، خالد ایوب، میاں عبدالغنی، عتیق احمد و دیگر شامل تھے۔ اس تقریب میں ترقی پسند ادب کا ''احساس'' جو کی رونمائی ہوئی جسے احباب نے بے حد سراہا سبھی دوستوں نے اس کے سرورق کی تعریف کرتے ہوئے اسے خیبر پختون خواہ کا نمائندہ ادبی پرچار قرار دیا۔

''قلم کارواں'' اسلام آباد کی نشست

گزشتہ دنوں ''قلم کارواں'' اسلام آباد کی ادبی نشست منعقد ہوئی جس میں سید علی گیلانی نے اپنا مضمون پڑھا۔ جبکہ صدارت بیدل جونپوری نے کی۔ سابقہ کارروائی کے بعد شرکاء کے اسرار پر ڈاکٹر عطاء اللہ کی نظم ''نوید صبح'' سنی گئی۔ صاحب صدارت نے علی گیلانی کو اپنا مضمون پیش کرنے کی دعوت دی تو انہوں نے ''وکان الانسان عجولا'' (اور انسان بہت ہی جلد باز واقع ہوا ہے) کے عنوان سے اپنا مضمون پیش کیا جسے شرکاء نے بڑی توجہ سے سنا۔ مضمون پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر ساجد خاکوانی نے کہا کہ قرآن مجید کی ایک آیت کو عنوان بنا کر مضمون لکھنا ایک بہت ہی عمدہ روایت ہے۔ دیگر متعدد آراء کے بعد آخر میں صاحب صدر بیدل جون پوری نے مجموعی طور پر مضمون کو ایک اچھی کاوش قرار دیا۔

❁❁❁

اس کی آنکھیں سوال کرتی ہیں
میری ہمت جواب دیتی ہے

سید مبارک شاہ

پنجابی شاعری

ہن تے بوہا کھول وے سائیاں
نال اساڈے بول وے سائیاں
کد تک ایس جہان دے اندر
پھریئے ڈانواں ڈول وے سائیاں
تینوں ساری جان پچھان اے
چھڈ ساڈی پڑچول وے سائیاں
کچے شیشے ورگی جندڑی
پتھراں وچ نہ رول وے سائیاں
ہن تے اپنے پیار دی مستی
ساڈے تو وچ گھول وے سائیاں
دل وچ تیری آس دا چانن
ہور تے کجھ نئیں کول وے سائیاں
ہولا ای سئی تیرا اسلم
ککھاں نال نہ تول وے سائیاں

اسلم کولسری

فیر باواں دی تانی بنئے
آ جا رل مل گوہلاں چنئے
کجھ ہسے کجھ رل کے روئیے
ہجر دی بھٹی یاداں بھنئے
بہہ کے یاداں دی دھپ چھاویں
اتھرواں وچوں سدھراں چنئے
سر تے وری آن کھلوتا
کی کیتا جندے بے گنئے
دل دے سبھے ڈکھڑے زیبا
آپے کہیے آپے سنئے

مسرت جبیں زیبا/کویت

شہر وکھرا وسان ٹریا ساں
سر کرن اسمان ٹریا ساں
اوہنے کجھی زمین پیراں چوں
جس نوں سر تے بٹھان ٹریا ساں
رو پیا حال ویکھ کے اوہدا
زخم اپنے وکھان ٹریا ساں
مٹ گئے نقش کیوں ہتھیلی دے
میں تے سرہوں جمان ٹریا ساں
ساڑ دتا اے مینوں ساحل نے
کشتیاں میں جلان ٹریا ساں
زندگی ڈھل گئی عذاباں وچ
میں زمانے تے چھان ٹریا ساں
لیکھ سولی تے لے گیا شاہد
دین سچ نوں زبان ٹریا ساں

ہمایوں پرویز شاہد

دل قاتل نگاہ نال لڑن چلیا
پتلا موم دا سورج نوں پھڑن چلیا
کالے ناگ دے سر دی سونہہ کھا کے
انھا ماندری زلفاں پھڑن چلیا
اک مورتی دی کرامات ویکھو
زاہد عشق دے فلسفے پڑھن چلیا
کسے حور دے متھے دا ویکھو ٹکہ
ملاں متھے محراب اے جڑن چلیا
ہسدے پھل دا یارو فریب کھا کے
بلبل کنڈیاں نال اے اڑن چلیا
سسی سوہنی دی داستان سن کے
دل ڈبّ چلیا جگر سڑن چلیا
سر بام دلدار دی ویکھ صورت
عدل ہس کے سولی تے چڑھن چلیا

عدل منہاس/لاہوری

غم منگاں غمگین نہ دین
ہاسے شوم کمین نہ دین
آس دا دارو مہنگا، توبہ
تراساں متوں چین نہ دین
پراتاں روڑے چین نوں
زہر کٹوری چین نہ دین
بھراں تروپے کانا ہتھاں
چوہلے لیراں سین نہ دین
کن من امبر چھڈیا ناہیں
بسر دی تھاں تکین نہ دین
روح اسماناں توں مڑ آوے
مہنگی قبر زمین نہ دین
سارے حرف لکوئے ویلے
عین غین تے شین نہ دین

عظمت نصیب گل

دھرتی دا منہ تنگ نہ جاوے
پانی کدھرے مک نہ جاوے
ہولے ہولے ایہہ ہریائی

پنجابی شاعری

لکھاں اوہلے لک نہ جاوے
دیس دے دشمن ترٹھیاں لاندے
حاکم ڈر کے جھک نہ جاوے
رتی سڑیاں دل نہیں جاندے
سچاں دی وی شک نہ جاوے
ایہہ کم بڑا ضروری سجنو
ڈیماں دا کم رُک نہ جاوے
منگھیائی وتے کنڈھ کڑا کے
لک تے پئی چک نہ جاوے
منگے فراست خیر وطن دی
شالا پانی مُک نہ جاوے

سیّد فراست بخاری

کندھاں لیتن پوچن لئی توں چنگی مٹی گو
اُچا کوٹھا پاون لئی توں آپ وی اُچا ہو
پھلاں ورگے یارنوں دل وچ پھلاں وانگ رکھ
پیار دا گجرا گھل تے اوہدے کلیاں چُل پرو
جے رب دل چوں لبھنا ایں تے اکو رستا اے
چار چوفیرے نسنا چھڈ دے رب دے لاگے ہو
رب نوں راضی کردے جیہڑے راتیں سوندے نہیں
اُٹھ کے یار منا لے باہر لگی نی لو
رات دنے جو محنت کردے جھولیاں بھردے نیں
نہ ایویں توں مندا بولیں نہ قسمت نوں رو
پیار دی کھیڈ جے کھیڈی اے تے نفرت مار مکا
دھرتی تے جے زندہ رہنا پیار دلا جی وی بو

اُلٹ جے کجھ سکھنا ایں تے عالماں دے سنگ بہہ
علماں والے سنگھ لیندے نیں علماں دی خوشبو

ڈاکٹر سعید اُلفت

منزل اپنی اکو اے پر وکھ نے ساڈیاں راہواں
اَج تے وکھ نے بت وی ساڈے پر اک نے ساڈیاں ساہواں
نہ ملئے تاں دل گھبراوے جے ملئے تاں غیراں وانگوں
اپنی پریت انوکھی اے کیویں لوکاں نوں سمجھاواں
وچھڑیاں ناں مرے جایئے سجناں کوئی گھیں پتہ حیاتی دا
ہن تے آ جا کول توں سجناں ویکھ کے کھلیاں باہواں
روز ازل توں دل میرے وچ صورت تیری وسدی اے
آل دوالے جد ویکھاں ہر پاسے تیرا پرچھانواں
اک ندی دے کنڈے دوویں اک توں تے اک میں
توں وی اندروں روئی جاویں میں وی دکھ چھپانواں

محمد علی اسد بھٹی

گل سی تیرے میرے وچ
کسراں پہنچی ڈیرے وچ
دل دا کاسہ بھریا نہیں
بھاویں ہنجو کیرے وچ
تیری یاد سہارا اے
جگنو جیویں ہنیرے وچ
جی کردا اے ڈُب جاواں
اکھ دے گھسن گھیرے وچ

مر گئے آں اداواں تے
ہور کیہ رکھیا اے تیرے وچ
چڑھ دا سورج تکیا تے
دس پئی رات سویرے وچ
بوتے لوکیں ہوندے نیں
شاقی گل اچیرے وچ

عقیل شاقی

جتھوں پیار کہانی پچھ لے
سکدی پئی اے جوانی پچھ لے
تیرے باجھوں دل دی دُنیا
ہوئی کنجے ویرانی پچھ لے
جیہڑی سوہنا چھوڑ گیا ایں
کی اوہ خوبانی پچھ لے
ویہڑے دے وچ نچے تاں
میری لال مدھانی پچھ لے
ویکھ ویکھ کے کالے بدل
رووے جند نمانی پچھ لے
دل دی دھرتی سڑدی بلدی
ظالم بدلا پانی پچھ لے
تیرے سوہنے رُوپ توں واری
کدھر گئی جوانی، پچھ لے
تیرے دل وچ کیہ رکھیا
ساتھوں مونہہ زبانی پچھ لے
گل زیب دوجے لوکاں توں
ہنڈ دی کنج جوانی پچھ لے

گل زیب عباسی

ہنیرے چوں اواز

ملک شاہ سوار علی ناصر

اوہ رات سیاں دی پوچھل آر ڈاہڈی لمی تے ٹھنڈی ٹھار آہی۔ میں اپنے کمرے دے وچ اپنے بسترے تے پاسے پرت پرت کے سون دا آہر پیا کرداساں۔ پر انج لگدا سی جے اج نیندر رُس گئی اے۔ یاں کدائیں اُڈ پڈ گئی اے۔ لمی رات تے باہر شاں شاں کردا گھپ ہنیرا مینوں سیاں بار ڈنگن لگ پیا۔ مینوں انج لگدا سی اج دی رات دے ہنیرے دکھاں دی جنج چاڑھ کے میرے آسے پاسے نچدے پئے ہوون

رات ہور لمی ہوندی گئی تے ہنیرے مینوں ڈنگن لگ پئے۔ شاں شاں دیاں اوازاں مینوں ہور دکھی کردتا۔ تے میری حیاتی دے سارے دُکھ تے سکھ اِک اِک کر کے قطار بنھ کے میرے اگوں لنگھن لگ پئے۔ میں اس اکلاپے دے وچ ایہہ گل سوچن تے مجبور ہو گیا جے میں اپنی حیاتی دے وچ کنے جفر جالے نیں۔ کنے دُکھ کٹے نیں۔ کنیاں مصیبتاں جھل کے آیا واں۔ کنے دکھ دے دریا پار کر کے آیا واں۔ ایہہ سارے دُکھ قطارا بنا بنا کے میرے سامنے آن کھلوتے۔

اینہاں دکھاں دیاں قطاراں چوں مینوں سبھ توں وڈا دُکھ دھرتی ماں دا دکھ نظریں آیا۔ دھرتی ماں دے دُکھاں نوں ویکھ کے میرا دل کنبن لگ پیا۔ تے میرے اندر دے جہان دے وچ بھونچال جیہا آ گیا۔ اپنی حیاتی دے سارے دکھاں نالوں ایہہ دُکھ مینوں وکھری ناپ دا لگیا۔ میں دھرتی ماں دے دکھاں نوں ویکھ کے اپنے آپ نوں قصوروار سمجھن لگ پیا۔ جے میں وی اپنی ماں دھرتی نوں کوہجا تے کوہلا کرن دے جرم وچ شامل ہاں۔ اس دھرتی دا حلیہ وگاڑن دے وچ میرا وی برابر دا حصہ اے۔ میں وی اس بھیڑے کم دے وچ برابر دا حصہ دار ہاں۔

ہنیرے میرے اگے پچھے اپنے پر ہوا کھلار دتے۔ تے رات مینوں ہور وی ڈراونی جہی لگن لگ پئی۔ اجے تائیں نیندر اکھیاں کولوں کوہاں دی وتھ تے دور سی۔ میں رج پلیٹے مارے رج کلمے دا ورد کیتا۔ بار بار آیۃ الکرسی پڑھی پر نیندر میرے نیڑے نہ آئی۔ میں ڈوجے پاسے منہ پرت کے سون دا چارہ کیتا پر گل نہ بنی۔ مینوں ہنیرے دے سپ ہور ڈنگن لگ پئے۔ تے اینہاں ہنیریاں چوں ون سونیاں اوازاں آون لگ پئیاں۔ ایہہ اوازاں مینوں اپنے وڈ وڈیریاں دیاں جاپدیاں سن۔ رج غور کیتا۔ بوہت گوہڑ ماریا جے اج میرے کولوں کیہڑا نواں گناہ ہو گیا اے۔ جے باپے ناراض ہو کے ہوکاں پئے دیندے نیں۔ باپیاں دیاں ایہہ ہوکاں مینوں ہور دُکھی کر چھڈیا۔ میں سوچ سوچ کے ہپھاواں ہو گیا۔ پر کوئی ایہو جہی گل میری عقل دے نیڑیوں نہ لنگھی۔

ہنیرا ہور ڈونگھا ہوندا گیا۔ تے ایہہ ہوکاں وددھیاں گئیاں۔ ایہہ دل خراش ہوکاں سن کے میں اس گل تے ریڑ گیا۔ جے گل کوئی خاص اے۔ اینہاں ہوکاں دے پچھے کوئی خاص گل اے۔ تے اج دا ایہہ دُکھ خیر دا نہیں اے۔ کوئی گڑبڑ ایہو جہی ہو گئی اے جہڑی نہیں سی ہونی چاہیدی اے۔ کوئی اوپرا حادثہ ہو گیا اے۔ کوئی نویں کہانی ایں......

میرے ہر پاسے ہنیرے دا راج سی۔ تے میرے اندر دے جہان وچ دُکھاں دے بھانبڑ بلن لگ پئے۔ اس ہنیرے چوں ہوکاں دیاں اوازاں جہڑیاں میرے وڈ وڈیریاں دیاں سن ہور ودھن لگ پئیاں۔ تے اخیر اک رُعب دار تے سن کھچویں جہی اواز آئی۔ ایہہ اواز سن کے مینوں کجھ تسلی جہی ہوئی۔ میں اپنے بسترے تے اُٹھ کے بہہ گیا تے ہنیرے چوں آون والی اس سن کھچویں اواز دی اڈیک کرن لگ پیا۔ اواز آئی میریا پترا! میں محمد علی جناں واں۔ اج تے توں ظلم دی اخیر کر چھڈی اے۔ جتھے میں حیاتی دے آخری ڈنگ بیماری دی حالت دے وچ ٹپائے آہے۔ توں میرا اوہ ''گھر'' وی اُڈا چھڈیا اے۔ ایہہ گل سن کے ہنجو میریاں اکھاں چوں ٹپ ٹپ وہن لگ پئے......

نامہ ہائے احباب

دو غزلیں ارژنگ کے لیے ارسال خدمت ہیں۔ چند اشعار شہزاد احمد شہزاد کی موت پر کہے تھے جو میں بروقت آپ کو ارسال نہ کر سکا۔ جواب بھیج رہا ہوں۔ خدا کرے آپ معہ اہل خانہ خیریت سے ہوں۔ فقط والسلام

دُعا گو

نصرت صدیقی

پیارے اور سوہنے عامر بن علی اور حسن عباسی صاحبان ارژنگ ہی ارژنگ۔

السلام علیکم۔ ارژنگ کے حُسن نے ایک پرانے خوبصورت لہجے کے شاعر کا کہا سنا یاد کرا دیا ''باغ بہاراں تے گل زاراں......'' ارژنگ ترتیب انتخاب اور معیار میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کا مطالعہ دل افروز اور لطف انگیز ہے۔ ''شعری گوشے'' کے حصے میں شاعری باغ بہاراں ہے۔ نئے شعر پسند آئے۔ اس شعر کے اندر باہر سخن فہمی کے دروازے کھل رہے ہیں۔ جہاں سے جی چاہے اندر جاؤ جہاں سے جی چاہے باہر نکلو۔ شعر ہے:

نکلے تھے یہ کس اندھیرے کے سفر پر
آنکھیں تو پلٹ آئیں، تماشا نہیں آیا

آپ نے میری غزل شائع کی نظم بھی۔ آپ حسن ہیں آپ کا حسن ظن ہے کہ آپ ایک ''پہاڑی'' کا کلام لائق توجہ سمجھتے ہیں سمجھتے رہیں ثواب کا کام ہے۔ افسانے پڑھ لیے ہیں۔ ایک بات کہوں ہماری جید افسانہ نگار ''سیکس'' کے بھونڈے پن کو زیادہ ''موضوع'' کرتی ہیں۔ ایسا ''موضوع'' جو نسوانی اعتبارات سے ''بعید'' ہے۔ یہاں ''قاعدے'' سے بات ہونی چاہیے۔ علی رضا حمد، نعت اور سلام میں جی جان سے حاضر خدمت ہیں۔ انہوں نے حال ہی میں ایک ''سلامیہ'' انتخاب شائع کیا ہے۔ اہل قلم کانفرنس مجھے بھی ایک نسخہ عطا کیا تھا۔ میں نے بقولے آنسوؤں کی روشنی میں پڑھا۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ ارژنگ کی صورت میں آپ کو ''مشکیزہ'' نصیب ہوا جس سے ہم لوگ گھونٹ گھونٹ پیاس بجھاتے ہیں۔

خیر اندیش

آصف ثاقب

جناب حسن عباسی صاحب

السلام علیکم۔ طرفین خیریت مطلوب۔

''ارژنگ'' کے لیے دس عدد غزلیں اور مختصر تعارف بھیج رہا ہوں۔ اس اُمید پر کہ شائع کر کے شکریے کا موقع فراہم کریں گے۔ آپ کی محبتوں اور دعاؤں کا طالب۔

امین اڈیرائی

ڈیئر حسن عباسی! پیار و دعائیں۔

آپ اور عامر بن علی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اتنا خوبصورت پرچہ نکالا۔ پرچہ اپنی نثر اور شاعری کے حوالے سے انتہائی معتبر ہے۔ دعا ہے کہ یہ آنے والے وقتوں میں خوب پھلے پھولے۔ دُعاؤں کے ساتھ

سلمیٰ اعوان

جناب محترم عامر بن علی، حسن عباسی صاحب

السلام علیکم۔ اُمید ہے کہ آپ تمام لوگ بہ خیریت ہوں گے۔ جب میرا یہ خط آپ کو وصول ہوگا تب تک آپ کو میری دونوں حالیہ کتب مل چکی ہوں گی۔ پرچا ''ارژنگ'' میں ان کا ذکر خیر (تبصرہ) ضرور کیجیے گا اور پرچا ارژنگ ہمیں وصول نہیں ہو پا رہا۔ اس بات کو نوٹ فرمائیں اور اپنی ڈاک فہرست کو دوبارہ نظر کرم سے نوازیے۔ جہاں پر بھول ہے درست کر دیجیے۔

ارژنگ کے لیے اردو اور پنجابی کلام ارسال خدمت ہے۔ اُمید ہے آپ حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ جون جولائی میں لاہور آنے کی اُمید ہے۔ آئے تو ملاقات ضرور ہوگی۔ والسلام

گل زیب عباسی

محترم حسن عباسی! اسلام مسنون

''ارژنگ'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس کے مشمولات میں کافی ساری تخلیقات ایسی ہیں جنہوں نے مجھے رکنے، رک کر غور کرنے اور بار دگر پڑھ کر حظ اٹھانے پر مجبور کیا۔ شعراء کے گوشے بطور خاص اہم ہیں کہ ان کی مدد سے کسی شاعر کی ایک ساتھ چار پانچ تخلیقات پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے اس کی مدد سے ایک طرف شاعر کے خاص اسلوب کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور دوسری طرف شاعر کے تخلیقی عمل کی سطح بھی کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ اداریہ میں آپ نے جن امور کی طرف ہماری توجہ مبذول کروائی ہے یہ معاملات کم و بیش ہر تقریب کا حصہ ہوتے ہیں اور ان سے بچنا شاید ممکن نہیں ہے۔ گوشہ عقیدت میں علی رضا کی نعتوں میں عقیدت کی شیرینی اور والہانہ پن نے تازگی کی مستقل لہر دوڑا دی ہے جو ان نعتوں کو اہم بناتی ہے۔

پروفیسر جمیل احمد عدیل کا تاثراتی مضمون افتخار مجاز کی محبت بھری شخصیت کے مختلف زاویوں کو اُبھارنے کا کام بخوبی انجام دے رہا ہے۔

عامر سہیل نے اساطیری حوالوں اور بعض تاریخی

حوالوں سے اپنی نظم کو بالخصوص آراستہ کیا ہے۔ غزل میں یہ رنگ پوری طرح نہیں کھل سکا۔ ان کو اظہار الحق، شوکت ہاشمی، شناور اسحاق اور معین نظامی کے طرز اظہار کے ساتھ وابستہ کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔ سلیم شہزاد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے عامر سہیل کے شعری آہنگ سے جڑی ہوئی نثر میں بات کی ہے اور اچھا تجزیہ کیا ہے۔

باذش بخیر گورا پبلشرز ان دنوں آباد تھا۔ میں اور ڈاکٹر اشفاق احمد ورک بیٹھے ہوئے تھے کہ ظفر اقبال اور عطاء الحق قاسمی صاحب تشریف لائے۔ ان دنوں ''معاصر'' زیادہ سرگرمی سے نکلا کرتا تھا۔ عطاء صاحب کہنے لگے کہ باقی تو سب کچھ پرچے کے لیے موصول ہو جاتا ہے مگر اچھے افسانے نہیں ملتے مگر ارژنگ اس حوالے سے خوش قسمت ہے کہ اس میں پروین عاطف، نیلم احمد بشیر اور شاہد جمیل جیسے افسانہ نگاروں کی تخلیقات موجود ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ حصہ اہم ہے۔ نئے لوگوں کے ہاں افسانے کے آرٹ کے بارے میں ابھی ناواقفیت کے کچھ عناصر نظر آتے ہیں جو ایسے بے محل نہیں ہیں۔ جوں جوں یہ لوگ آگے بڑھیں گے یہ کمی دور ہوتی چلی جائے گی۔

ادبی گوشوں میں ظفر اقبال، عطاء الحق قاسمی، نجیب احمد اور باقی احمد پوری جیسے کہنہ مشق شعراء کی موجودگی انہیں معتبر بنا رہی ہے۔ نجیب احمد کے پاس ہمیں احمد ندیم قاسمی کے اسلوب کی بازگشت سنائی دیتی ہے جو قریب قریب اپنے امکانات پورے کر چکا ہے۔ گوشہ کے اوپر دیا گیا ان کا شعر اکثر حوالے کے طور پر پیش ہوتا ہے مگر اس میں بھی ذم کا پہلو غالب ہے۔ ان لوگوں میں بالخصوص شاہد ذکی اور افضل خاں نے متاثر کیا۔ کچھ منتخب اشعار پیش ہیں۔

ظفر اقبال:

منزل الگ تراشی، رستہ الگ بنایا
پھر ڈوبنے کو ہم نے دریا الگ بنایا

عطاء الحق قاسمی:

میں وہ دعا ہوں عطا جو ہر ایک لب پہ ہے
بس اتنا ہے کہ ابھی عرصہ قبول میں ہوں

باقی احمد پوری:

اب اسے تو ہی منائے تو منائے آ کر
ایک فتنہ جو ترے نام سے بیدار ہوا

حمیدہ شاہین:

میں کس منڈیر پہ رکھتی چراغ کارِ سخن
یہ بارِ نور بدستِ شبِ فراغ اٹھا

شاہد ذکی:

میں تو یوں چپ ہوں کہ اندر سے بہت خالی ہوں
اور یہ لوگ پراسرار سمجھتے ہیں مجھے

افضل خان:

یہ محرومی بھی میرے پاؤں سے لپٹی ہوئی ہے
جہاں میں جا نہیں سکتا وہاں جانا ہے مجھ کو
بدن کے غارِ حرا میں خموش بیٹھا ہوں
کہ شاید ایسے غزل کا نزول ہو جائے

سرور ارمان:

ملا جو حکم رہائی تو جاں نثار ترے
لپٹ کے روتے رہے جیل کی فصیلوں سے

عامر سہیل:

وہ میرے حال پہ روتی ہے عامر
تو کیا ہوتے ہیں آنسو پتھروں کے
میں لکھتا ہوں وہ باتیں جن کو عامر
بھلا بیٹھے ہیں جتنے شاعروں کے

مقصود عامر:

پہلے لکھتا ہوں میں کاغذ پہ مسائل اپنے
اور پھر صبر کے دریا میں بہا دیتا ہوں

کتب پر تبصرہ اور تقاریب کی روداد سے پرچے کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک بھرپور جریدہ ہے۔

ارشد نعیم
یکم جون ۲۰۱۳ء

بھائی حسن عباسی صاحب!
السلام علیکم۔ اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

''ارژنگ'' باقاعدہ مل رہا ہے۔ آپ کا سپاس گزار ہوں زندگی کے کچھ دن ''ارژنگ'' کے مطالعے میں گزر جاتے ہیں۔ عہد حاضر میں جیسے کہ آپ کو پتہ ہے کہ ہر بندہ پریشانی میں دکھائی دیتا ہے۔ کوئی کتاب ہاتھ لگ جائے تو غنیمت ہے۔ پچھلے دنوں ''محبت کے پروں میں گھنگھیاں باندھو'' بھارت کا سفرنامہ دوبارہ دیکھا ہے آپ نے جو بھارت کی مجھے تصورات میں سیر کروائی ہے تا حال اسی سفرنامے کے سحر میں کھویا ہوا ہوں۔ خدا نے چاہا تو آپ سے جلد لاہور میں ملاقات ہوگی۔ تازہ کلام حاضر ہے۔ قبول فرمائیے۔

اسد اعوان
جھنگ روڈ، ساہیوال (سرگودھا)

عزیزی..... دعائیں۔ سلام!

آپ سے وعدہ تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ افسانہ تسنیم کوثر کو دے دوں۔ آپ ان سے وصول کر لیں گے۔ آپ ان کی کتاب کی تقریب پذیرائی میں بوجوہ شریک نہ ہو سکے اور اس کے بعد تسنیم سے میری ملاقات بس روانگی کے وقت ہوئی۔ بہر حال! افسانہ بھیج کر وعدہ پورا کر رہی ہوں۔ دعاؤں کے ساتھ

عذرا اصغر
۲۸ راپریل ۲۰۱۳ء

محترم و مکرم جناب حسن عباسی صاحب!
سلام مسنون! وطنِ عزیز کے حالات کے تناظر میں الہام ہونے والی تازہ نظم ''کربلائیں ہی کربلائیں'' ارژنگ کے لیے بھجوا رہا ہوں۔

آپ کی کتابوں کے حوالے سے ساہیوال میں منعقدہ خوبصورت تقریب کے لیے مبارک باد!

آخر میں میرا اور مسعود احمد کا پرخلوص سلام!

نیاز کیش
احمد جلیل

بقیہ انٹرویو ڈاکٹر محسن مگھیانہ

ارژنگ: آپ اپنی کتابوں کی تفصیل قارئین کو بتانا پسند کریں گے؟

ڈاکٹر محسن مگھیانہ: میری پہلی کتاب تو مزاحیہ آپ بیتی تھی جو "انوکھا لاڈلا" کے نام سے شائع ہوئی تھی اور جس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس کے بعد "بھنبھیری" کہانیوں کی کتاب تھی جو پنجابی لاہندی میں شائع ہوئی۔ طنز و مزاح کی کتاب "چھیڑ خانی" اُردو میں شائع ہوئی۔ اسی طرح "دیسی ان ولایت" میرا سفرنامہ تھا "مسئلہ ہی کوئی نہیں" طنز و مزاح پر مبنی میرے کالموں کا مجموعہ۔ اسی طرح اٹھنڈرے، انکھلیاں، چھتا، الف میم (حج کا سفرنامہ) یہ کیسی محبت ہے، موتی رولن مرے، پنجابی ماہیے کی کتاب ہے۔ حسن مصر، تیرے باجھوں اور خالی ہاتھ زیر طبع ہیں۔

ارژنگ: کیا آپ کی تخلیقات پر کوئی تحقیقی کام بھی ہوا ہے؟

ڈاکٹر محسن مگھیانہ: اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں میری مزاحیہ آپ بیتی "انوکھا لاڈلا" کے موضوع پر ایم اے کا تھیسس ہوا ہے۔ یونیورسٹی کی فیکلٹی تو میری شخصیت اور فن پر پی ایچ ڈی اور ایم فل بھی کروانا چاہتی تھی۔ مگر جس پر پی ایچ ڈی کرنا ہو اس شخصیت کا وفات پا جانا ضروری ہے اور ایم فل طالب علم صرف اس ادیب پر ہی کر سکتے ہیں جو ساٹھ سال کی عمر سے زیادہ ہے۔ ظاہر ہے میں نہ تو فوت ہوا ہوں اور نہ ہی ساٹھ سال کے سنہری ہندسے کو پہنچا ہوں اس لیے ایم اے کی سطح پر ہی میرے فن پر کام ممکن ہے جو کہ ہو بھی چکا ہے اور مزید ہو بھی رہا ہے۔

ارژنگ: جھنگ سے آپ کا تعلق بڑا جذباتی محسوس ہوتا ہے، کیا کہیں گے اس پر؟

ڈاکٹر محسن مگھیانہ: جھنگ ہیر رانجھا، مرزا صاحباں اور سلطان باہو کی سرزمین ہے۔ دوسری طرف جھنگ کے دو سائنسدانوں کو نوبل پرائز ملا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام اور راگ بنگ کھرانہ، اتفاق کی بات ہے کہ دونوں کو فزکس کے شعبے میں ہی انعام ملا ہے۔ ایسی متمول تاریخ اور روایات کا شہر جب آپ کا جنم استھان بھی ہو تو اس رشتے میں جذباتیت کا عنصر تو لازمی ہوگا۔

ارژنگ: آپ میڈیکل سرجن ہو کر ڈاکٹر عبدالسلام اور راگ بنگ کھرانہ کی روایت نبھا رہے ہیں اور شعر و سخن کر قم کر کے سلطان باہو کے قافلے میں بھی شامل ہیں۔ مگر یہاں رہتے ہوئے کبھی ادبی مراکز سے دوری کا احساس نہیں ہوا؟ میرا مقصد یہ ہے کہ میڈیا کے مراکز تو لاہور، کراچی، اسلام آباد ہیں؟

ڈاکٹر محسن مگھیانہ: یہاں رہتے ہوئے میڈیا میں آواز پہنچانا تو واقعی بڑا مشکل ہے۔ حالانکہ ہمارے ہاں ٹیلنٹ اتنا زیادہ ہے کہ شعراء کی بڑی تعداد کے سبب ہمیں مشاعرہ کرانا مشکل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ہمارے ہاں ٹیلنٹ اتنا زیادہ ہے کہ شعراء کی بڑی تعداد کے سبب ہمیں مشاعرہ کرانا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں روٹری کلب کا صدر تھا تو مجھے انتظامیہ کے لوگ کہتے کہ شعراء کی تعداد کم کریں۔ مگر میں اپنی معذوری ظاہر کرتا ہے کہ یہ بھی سٹیج پر پڑھنے کے حقدار ہیں۔ باقی ہمارے میڈیا میں کوریج کے لیے ذاتی واقفیت ہونا ضروری ہے۔ یہ المیہ تو بہرحال ہے کہ مجید امجد سے لے کر عفت سلطان تک لائم لائٹ میں نہیں آئے۔ حال ہی میں ظفر سعید فوت ہوئے جو بڑے جاندار شاعر تھے لیکن کوریج سے محروم رہے۔

میں تو کہتا ہوں کہ مجید امجد کو لائم لائٹ میں لانے کا سہرا بھی خواجہ محمد زکریا کے سر پر ہے۔ اگر خواجہ زکریا نہ ہوتے تو مجید امجد بھی شاید لائم لائٹ سے محروم رہتے۔

ارژنگ: ادیب کا معاشرے میں کیا کردار ہونا چاہیے؟ کیا ہمارا ادیب اپنا سماجی کردار صحیح طور پر نبھا رہا ہے؟

ڈاکٹر محسن مگھیانہ: ادیب بیچارہ تو اپنی طرف سے لکھ رہا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس کا پیغام ہی عوام تک نہیں پہنچ رہا ہے۔ المیہ یہ بھی ہے کہ معاشرے میں ادیب کو صحیح مقام اور عزت نہیں دی جا رہی۔ سماجی اعتبار سے دیکھیں تو ہمارے معاشرے کا رویہ بھی غیر مہذبانہ ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ انقلاب فرانس میں اتنے ادیب تھے اور انقلاب روس میں میکسم گورکی کے کردار سے لے کر تمام اس عہد کے اہل قلم کا انقلاب میں کلیدی کردار ہمارے سامنے تقابلی مقابلے کے لیے رکھا جاتا ہے۔ ارے بھائی! جس ملک میں کتاب کی تعداد ہی پانچ سو پر مشتمل شائع ہوگی۔ وہ کیا انقلاب لے آئے گی؟ خوش قسمتی سے میری کتابیں بکتی ہیں مگر اس کے باوجود اگر میں چاہوں کہ میری کتابوں کی مناسب انداز میں تشہیر و ترسیل ہو جائے تو شاید میں جو کچھ کماتا ہوں سب پبلشرز کی نذر ہو جائے۔ یہاں تو پڑھے لکھے لوگوں کا بھی یہ حال ہے کہ میں نے ایک ڈاکٹر دوست کو اپنی کتاب پیش کی۔ انہوں نے کتاب پر سرسری نظر ڈال کر مجھ سے کہا کہ یار محسن!...... پنجابی کون پڑھے؟ آپ دیکھیں کہ ملالہ یوسف زئی کی کتاب لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوگی۔ لہٰذا اس کا اثر بھی اسی تناسب سے ہوگا۔ ہمارے ہاں تو چند گنے چنے منیر نیازی اور مشتاق یوسفی جیسے لوگ ہیں جن کی کتابیں کچھ نہ کچھ بکتی رہتی ہیں۔ باقی اہل ادب کے لیے تو قارئین تلاش کرنا ہی مشکل منزل ہے۔

Poetry Hassan Abbasi

Translation Husnain Sehr

O MOON I HAVE MANY A COMPLAINT

(1)

O moon you are a drifter
Nights pass and you don't show up
You drift everywhere with no reason
But don't visit my quarters
O moon! You keep distance from me
O moon! I have many a complaint

(2)

What love has hurt you?
That your heart is full of sores
You don't tell your tale
And live in ecstasy of heavens
O moon! You don't talk to me
O moon! I have many a complaint

(3)

O moon you don't remain the same
You transform your Visage and change your paths
O moon! Alone in the night
You walk with populace of no importance
You don't get caught by any means
O moon! I have many a complaint

(4)

O moon! Whenever I get to behold you
You silently hide
Behind trees and clouds
As if your beauty will wane
You don't get caught by any means
O moon! I have many a complaint

(5)

What do my eyes lack?
That you behold your reflection in the lake
Capturing you in the mirror
I long to fulfill a dream
What dreams are? you don't recognize
O moon! I have many a complaint

(6)

Glowing with borrowed radiance
What are you proud of?
You treat me like a stranger
But know me since youth
O moon! I don't have a grievance
O moon! I have many a complaint

UNFINISHED POEM IN A STRANGE CITY

How beautiful is your city
Wherever I see
The glance does not return
The sleeping streets in the lap of mountains
Little houses scattered everywhere like toys
The sheets of sunlight on the roof tops
What a dreamlike vista
How beautiful is your city
The childlike clouds playing with each other
The frequent rains
The rocks Being wet with rain waters since origin
What a dreamlike vista
How beautiful is your city
The heavy shadows of trees
The stocks in the shadows
The aroma of blooming flowers on the stocks
But above all
You dwell here
How can I leave?
Whenever I set foot to leave
Your letter comes to mind
Where you wrote:
"When you visit my city
And decide to write a poem
Don't forget my eyes
For they are beautiful"
But what do you know
I have been wandering in your city the whole day
Probing your eyes in countless faces
How beautiful is your city
But how can I depart?
When my unfinished poem
Still needs your eyes.

Ayesha Zee Khan/Lhr

Ayesah belongs to a literary family, her grandfather and fatehr have both been in the writing field all their lives, and this is where she inherited her part of creativity. Ayesha is a major in Political Science. She started her literary journey from the age of 10 writing Urdu fiction stories for two children's magazines "Bachon ke Duniya" and "Taleem-o-Tarbiyat." Later, she pursued her goals in serious column writing in various English and Urdu Dailies of Pakistan writing mostly on Geo-Politics or Socio/Political problems inland: Being associated with the Pakistan Print media since 2004. She is a co-writer of "The cornered Rogue" with Sohail Parwaz, her English Anthology of Poetry "Building Bridges" earned her Saarc Young Poet Literary Award, 2012 by the Foundation of Saarc Writers and Literature. Ayesha is also a Publisher/Editor/Writer at the MHA Publications which was her grandfather's brainchild and which she revived 18 months ago. Her Blog is available online and can be found from the following link: ayeshazeekhan.blogspot.com/

Hope

God made the country
And man made the town
God made it happen and
we helped it drown
God provided the means
and we took a Frown
God looked Peacefully
while we went down
God Knocked on the wisdom
And man put the crown
For becoming a millionaire
He became all renowned
God waited for the wise
for a solution to be found
we thought we had Failed but
God put the zeal to rebound!!

CLIPS AND BOBBLES

Shoping in the town makes you glee
form one window to the other you see
Chains for the neck or ankles
Indeed, CLips And BObbbles
Buying bags and Accessories
those make you please
wrists with colorful glass bangles
indeed,Clips and bobbls
Makeup nail polishes oh what a treat
All those to make a women complete
Leather Belt with Diamantes buckle
indeed, clips and bobbles.

Book

I am Lover of book
Literanute, novels all
form my Favorite Stall
With the wrold in my hand
Different dynasties that crawl
Illustrations, Calligraphers of the land
to the great china wall
sometimes reading near the brook
form the tales of nepal
to pirates with a hook
and blown is senegal
stories of building castles in the sand
Or the man who was as tall
who to make the plane crash lannd
how many i have read i can't recall

Pakistan, my land

Unique is the land where i am born
where chilhood & frowing were to horn
memories of laughter, sorrow, happines and pain
Each fact of life opened a new challenge yet again
A land where mountains Rivers & Valleys are well Born
pinces, Mulberry, Walnut, Mango all well known
Harappa, Mohenjo Daro indus, Potohar , Taxila were to gain
History, Economics, and Archtecture now in bane
Migrants of persian, Grecian Parthain, arbab, White hun
afghan,turk,Mughal,saka,all blended and reborn
with colors and cuisine not found in any reign
Arts and crafts marvelet of the seasoned brain
western highlands, Karakorum And pamir mountains warn
The height and might of the land and its people with the scorn
for the new invaders and enemies shall shuffer in pain
with the wrath of its men will leave them slain
Buqueath the worldly estate and never condemn,
Beneficent powers of nature show tenacity
Form start of thw wrold humans know its veracity
A chain of happenings so beautiful in a logarithm
the existence of the unique blon is hard to fathom.

سماجی اعتبار سے ہمارے معاشرے کا رویہ مہذبانہ نہیں ہے: ڈاکٹر محسن مگھیانہ

شاعری کبھی کبھی، نثر زیادہ لکھتا ہوں ☆ میڈیا کوریج کے لیے واقفیت ہونا ضروری ہے

معروف مزاح نگار، شاعر اور کالم نویس ڈاکٹر محسن مگھیانہ کے ساتھ عامر بن علی کی گفتگو

اردو ادب کی روایت رہی ہے کہ نو واردان اپنے فنی سفر کا آغاز عموماً شاعری، مضامین نویسی یا پھر کہانی و ناول نویسی سے کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر محسن مگھیانہ کا یہ منفرد اعزاز ہے کہ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز مزاحیہ آپ بیتی کی اشاعت سے کیا۔ پیشے کے اعتبار سے میڈیکل سرجن ہیں مگر عموماً ادب کے قارئین انہیں پی ایچ ڈی ڈاکٹر سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بقول بیرون ملک مقیم پاکستانیوں میں ان کے متعلق یہ غلط فہمی زیادہ عام ہے کہ وہ طبیب نہیں بس ادیب ہیں۔ ان کی اب تک گیارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور مزید کتب پر ان کا کام جاری ہے۔ ایک قومی روزنامہ اخبار میں مستقل کالم بھی لکھتے ہیں۔ ان کا اصل نام نیاز علی خاں مگھیانہ ہے۔ مگر ادبی حلقوں میں اپنے قلمی نام محسن مگھیانہ کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۹۵۶ء میں پنجاب کے تاریخی شہر جھنگ میں ہوئی اور اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے اپنا مستقل قیام بھی اپنے آبائی شہر میں ہی رکھا۔ ادب اور ادب کے متعلق کئی قومی اور عالمی اعزازات حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے ساتھ حال ہی میں ہونے والی مختصر سی غیر رسمی گفتگو ''ارژنگ'' کے قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

ارژنگ: روایتی تعلیم تو آپ نے میڈیکل کے شعبے سے متعلق حاصل کی مگر آپ کی وجہ شہرت ادبی شعبہ بنا۔ سب سے پہلے تو ان دو مختلف شعبوں جنہیں متضاد بھی کہا جا سکتا ہے اپنے تعلق کے متعلق ہمیں بتائیں۔

ڈاکٹر محسن مگھیانہ: لکھنا تو میں نے آٹھویں جماعت سے ہی شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں میں بچوں کے اخبارات کے علاوہ کوہستان، مشرق اور جنگ میں بچوں کی کہانیاں اور لطیفے وغیرہ لکھ کر بھیج دیا کرتا تھا۔ مشق سخن تو تب سے جاری ہے۔ اس وقت مجھے یہ تو نہیں پتا تھا کہ میں ڈاکٹر بن جاؤں گا۔ ان دنوں ٹیلی فون اتنا عام نہیں تھا اور انٹرنیٹ ابھی آیا نہیں تھا۔ قلمی دوستی کا دور تھا، نویں جماعت میں تھا جب ہم نے سولہ صفحات پر مشتمل رسالہ ''شہید'' شروع کیا۔ مجھے گھر سے جو بھی پیسے ملتے سب کے سب انہی کاموں میں خرچ ہو جاتے تھے۔

ارژنگ: کالج کا زمانہ کیسا تھا؟

ڈاکٹر محسن مگھیانہ: گورنمنٹ کالج جھنگ سے میں نے ایف ایس سی کی تھی۔ کالج میں داخل ہوا تو میگزین کا ایڈیٹر بن گیا۔ ''کارواں'' کے نام سے شائع ہونے والا یہ بڑا بھرپور پرچہ تھا۔ آپ کو بتاتا چلوں کہ گورنمنٹ کالج جھنگ وہی کالج ہے جہاں سے نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام نے تعلیم حاصل کی تھی۔ انہوں نے اپنے دور میں یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔

بقیہ صفحہ نمبر 10

اپنی دہلیز پہ کچھ دیر پڑا رہنے دے
جیسے ہی ہوش میں آؤں گا چلا جاؤں گا

معروف شاعر اور سفرنامہ نگار
حسن عباسی کی مقبول عام کتابیں

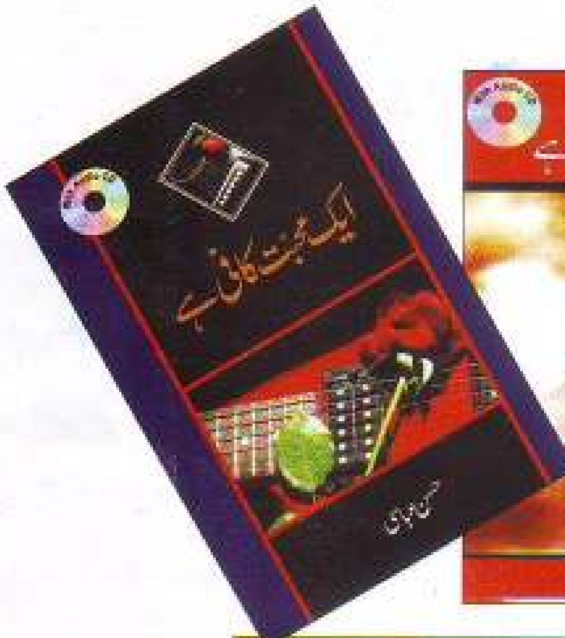

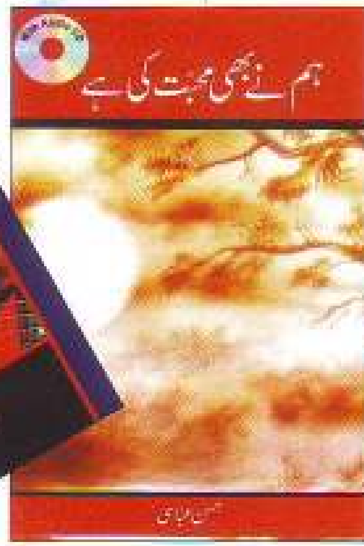

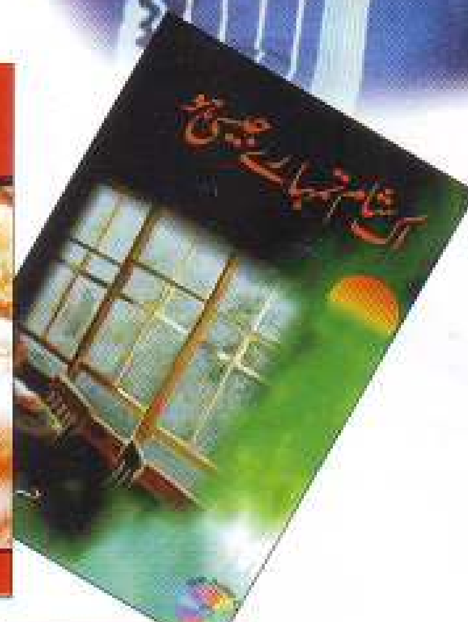

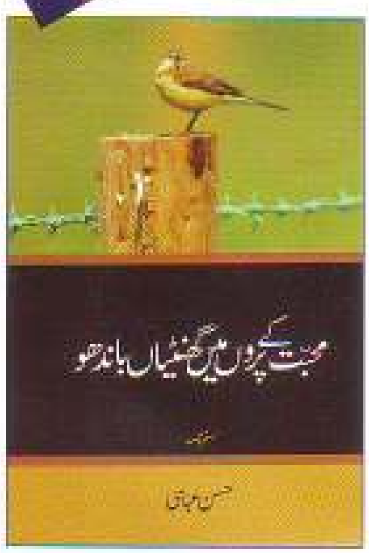

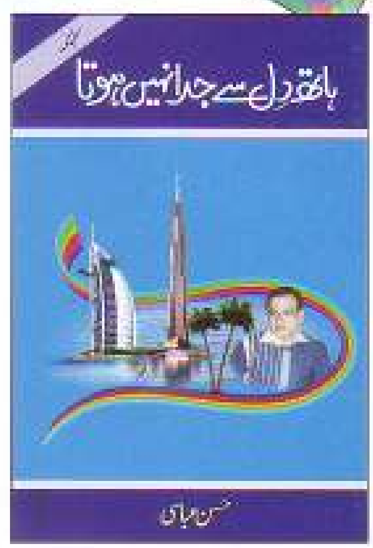

نستعلیق Publications
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
nastalique@yahoo.com
03004489310 - 04237351963